

مولانا حسن بریلوی کی ادبی خدمات

مقالہ نگار

ڈاکٹر گلشن آراء



وارث علوم اعلیٰ حضرت نبیرۂ حجۃ الاسلام جانشین مفتی اعظم ہند جگر گوشہ مفسر اعظم شیخ الاسلام والمسلمین قاضی القضاۃ تاج الشریعہ

حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اختر رضا خان قادری ازہری

اور خانوادۂ اعلیٰ حضرت کے دیگر علمائے کرام کی تصنیفات اور حیات و خدمات کے مطالعہ کے لئے وزٹ کریں

Waris e Uloom e Alahazrat, Nabirah e Hujjat ul Islam, Janasheen e Mufti e Azam Hind, Jigar Gosha e Mufassir e Azam Hind, Shaikh ul Islam Wal Muslimeen, Qazi ul Quzzat, Taj ush Shariah Mufti

Muhammad Akhtar Raza Khan

Qadiri Azhari Rahmatullahi Alihi

Or Khaanwada e Alahazrat k Deegar Ulama e Kiram Ki Tasneefat Or Hayaat o Khidmaat k Mutaluah k Liyae Visit Karen.

To discover about writings, services and relical life of the sacred heir of Imam Ahmed Raza, the grandson of Hujut-ul-Islam, the successor of Grand Mufti of India, his Holiness, Tajush-Shariah, Mufti

Muhammd Akhter Raza Khan

Qadri Azhari Rahmatullahi Alihi

the Chief Islamic Justice of India, and other Scholars and Imams of golden Razavi ancestry, visit

www.muftiakhtarrazakhan.com

Taaj-al-Shari'ah Foundation, Karachi, Pakistan.

تاج الشریعہ فاؤنڈیشن

0092 303 2886671 /makhtarraza1011

مولانا حسن بریلوی کی ادبی خدمات

مقالہ

برائے ماسٹر آف فلاسفی

مقالہ نگار

گلشن آراء

نگران

پروفیسر نصیر احمد خاں

(چئیر پرسن)

ہندستانی زبانوں کا مرکز
اسکول آف لینگویئز لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

۲۰۰۳ء

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
School of Language, Literature, & Culture Studies
NEW DELHI-110067, INDIA

DATE:21/7/2003

DECLARATION

I declare that the material in this dissertation entitled "**MAULANA HASAN BARAILVI KI ADABI KHIDMAT**" submitted by me is an original research work and has not been previously submitted for any other degree of this or any other University/Institution.

GULSHAN ARA
(Research Scholar)

21/7
PROF. NASEER AHMAD KHAN
(SUPERVISOR)
CIL/SLL&CS/JNU

21/7
PROF. NASEER AHMAD KHAN
(CHAIRPERSON)
CIL/SLL&CS/JNU

فہرست

دیباچہ

زیر نظر مقالے کا عنوان ''مولانا حسن رضا بریلوی کی ادبی خدمات'' ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے کی تحریک مجھے ایم۔اے کے دوران ہی مل گئی تھی۔ جب میں اعلیٰ حضرت کے آستانے پر گئی اور موصوف کے بارے میں ان کے خاندان کے افراد سے گفت وشنید ہوئی۔ مجھے لگا کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ نے مولانا حسن بریلوی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ وہ ہمہ جہتی شخصیت کے مالک تھے۔ غزل گو، نعت گو، نثر نگار، صحافی، مذہبی رہنما، ناظم اپنے استاد داغ دہلوی کے پیارے شاگرد اور ایک صاحب طرز شاعر و نثر نگار۔ پھر رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں انہیں کیوں نظر انداز کیا۔ لالہ سری رام کی تصنیف ''خمخانۂ جاوید'' میں بھی مولانا حسن رضا کا سرسری سا ذکر ہے۔ حسرت موہانی اپنے رسالے ''اردوئے معلیٰ'' میں ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے یہی سوالات ہیں جنہوں نے مجھے مجبور

کیا کہ میں مولانا حسنؔ بریلوی پر تحقیقی کام کروں۔

میرے خیال میں مولانا کی شخصیت ان کے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت کی وجہ سے دب کر رہ گئی تھی۔ جو مذہبی رہنما ہونے کے علاوہ دینی اور دنیاوی علوم و فنون کی دنیا کے سرتاج تھے اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کی نظر میں عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔ دوسرے مولانا خود دنیاوی معاملات سے زیادہ دین سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کا نعتیہ دیوان ''ذوقِ نعت'' ان کی زندگی میں اور بہاریہ شاعری کا دیوان ''ثمرِ فصاحت'' انتقال کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس لیے وہ نعتیہ شاعری کے مقابلے میں کم سنے زیادہ جانے جاتے تھے۔ اور وہ بھی شہر بریلی کے مقامی مشاعروں اور ادبی نشستوں میں۔ چوتھی وجہ مولانا کا عہد ہے۔ اس عہد کو جید عالموں قد آور سماجی رہنماؤں اعلیٰ ادبی شخصیتوں اور علمی وادبی قائدوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سرسید، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ اقبالؔ وغیرہ جن کی تحریروں نے ایوانِ علم وادب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس عہد میں مختلف تحریکوں، متعدد رجحانوں اور میلانات میں مولانا حسنؔ بریلوی کو کون پہچانتا اور وہ کیسے سنے اور پڑھے جاتے۔ اس لیے موصوف مذہبی تحریروں میں خصوصاً نعت ومنقبت تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ نثر میں ان کا قلم مذہبی عقائد کے گرد گھومتا تھا۔ غالبًا اسی لیے وہ علمی وادبی دنیا میں نظر انداز کیے گئے۔ بہر حال اس میں دورائے نہیں ہیں کہ مولانا کے قلم نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی ہے ان کا طرز نگارش منفرد ہے۔ ان کی اپنی پہچان ہے۔ اس لیے اردو زبان وادب کی تاریخ میں اپنے اسلوب کی وجہ سے

مولانا ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

مذکورہ بالا باتیں میری تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ان باتوں کے عکس سوالوں کی شکل میں میرے ذہن میں تھے۔ اسی لیے اس موضوع پر تحقیقی کام کا میں نے بیڑا اٹھایا۔ اپنے نگراں پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب سے موضوع کا ذکر کیا تو انہوں نے اس پر کام کرنے اور کرانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے دو چار نشستوں میں دھیرے دھیرے اپنی دلچسپی کی وجہ بتائی تو ان کی رضا مندی حاصل ہوئی اور مجھے اپنے پسندیدہ موضوع پر کام کرنے کا موقع ملا۔

زیرِ نظر مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب کا عنوان ''حیات اور کارنامے'' ہے جو مولانا حسنؔ رضا بریلوی کے حالاتِ زندگی سے متعلق ہے۔ اس باب میں مختصر سوانحی خاکے کے علاوہ مطبوعہ تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''عہد، معاصرین ادبی فضاء'' ہے جس میں مولانا کے عہد کا سیاسی و سماجی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہے۔ اور مولانا کے عہد کی علمی و ادبی فضا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح مولانا حسنؔ بریلوی کو سمجھنے اور ان کی تصانیف کو پرکھنے کے لیے جس سیاق کی ضرورت ہے وہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

تیسرا باب ''حسنؔ رضا کی ادبی خدمات'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں مولانا کی تحریروں کی علمی و ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں مولانا کی زیادہ تر تحریریں مذہبی ہیں۔ اس لیے ان سے گریز کرتے ہوئے صرف نعتیہ کلام کے شعری محاسن اور نثر میں ان کے اسلوب پر

خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

چوتھا یا آخری باب مولانا حسن بریلوی کی بہاریہ شاعری سے متعلق ہے جو ''ثمرِ فصاحت'' کے نام سے ایک دیوان کی شکل میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس باب میں ثمرِ فصاحت کا ادبی وفنی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی غزلوں کی خصوصیات، معنی ومفہوم، آہنگ واسلوب، افکار وخیالات اور فنی محاسن سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ یہاں داغ دہلوی کے ''پیارے شاگرد'' کی غزلوں پر اپنے استاد کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا کے شعری اسلوب کو سمجھنے اور اس کی خصوصیات وکیفیات کا بیان بھی اس باب میں شامل ہے۔

اس مقالے کی تیاری میں مجھے کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ کچھ ذاتی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ اور کچھ مقالے سے متعلق ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری ثابت قدمی نے مجھے میری منزل تک پہنچا دیا۔ موضوع کے انتخاب میں اپنے نگراں کو ہم خیال بنانا، انیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے شاعر وادیب سے متعلق مواد جمع کرنا، ادبی اور مذہبی تحریروں کے طاق نسیاں سے ایک فنکار کو نکالنا اور ثمرِ فصاحت کے نام سے دیوان میں چھپے ہوئے کلام کی قدر وقیمت متعین کرنا ایک ریسرچ اسکالر کے سامنے کئی مسائل کھڑے کرتے ہیں۔ میں انتہائی شکر گزار ہوں اپنے نگراں محترم پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب کی جنہوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔ وہ ایک مشفق استاد میرے ایسے کرم فرما ہیں جنہوں نے اپنی شفقتوں سے والدین کی

کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ اپنی سرپرستی میں مجھے رکھ کر میری کوتاہیوں، خامیوں اور کمزوریوں کو دور کیا اور ایک سچے استاد کی طرح مجھے وہ سب کچھ دیا جو ایک شاگردہ کا حق ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں اعلیٰ حضرت کے خاندان کے مختلف افراد کی بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مواد کی فراہمی میں ہر طرح کا تعاون دیا۔ اس مقالے کے تیاری میں جس حوصلے اور لگن کی ضرورت تھی وہ مجھے عصمت پروین، ڈاکٹر ظہیر رحمتی بھائی، سہیل ثاقب بھائی اور محمد عالم بھائی سے حاصل ہوا۔ میں ان سب کی بھی مشکور و ممنون ہوں۔

8

مورخہ ۲۱/جولائی ۲۰۰۳ء

گلشن آراء

روم نمبر ۲۲۹ گنگا ہوسٹل

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

باب اول

حیات اور کارنامے

مولانا حسنؔ بریلوی کا پورا نام حسن رضا خاں تھا۔ آپ ۱۹؍اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بریلی شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولانا نقی علی خاں تھا۔ ان کے آباواجداد مغلیہ عہد میں قندھار سے ہندستان آئے تھے۔ سعید اللہ خاں کو شش ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ محمد سعادت یار خاں، محمد شاہ کے وزیر تھے جن کے نام سے دہلی میں بازار سعادت گنج اور سعادت خاں کی نہر منسوب تھیں۔ حافظ محمد کاظم علی خاں بدایوں کے تحصیلدار تھے۔ جنہیں آٹھ گاؤں معافی کے عطا ہوئے تھے۔ مولانا شاہ رضا علی خاں کا شمار صوفیوں میں ہوتا تھا۔ مولانا نقی علی خاں عالم دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ان ہی کے فیض تربیت میں حسن رضا خاں نے پرورش پائی۔ آپ کے اس شجرۂ نسب میں بڑے بھائی مولانا احمد رضا خاں مشہور عالمِ دین مہندس، علم جفر کے ماہر، متقی و پرہیزگار اور بلند پایہ نعت گو شاعر تھے۔

مولانا حسن رضا بریلوی نے مروجہ علوم اپنے خاندانی بزرگوں سے حاصل کیے

اور معقولات و منقولات میں مہارت حاصل کرنے کے بعد طالبانِ علم دین کو درس دینے کا فرض منصبی انجام دیا۔ خدا نے طبیعت موزوں عطا کی تھی۔ اس لیے شعر گوئی کی طرف بھی راغب ہوئے۔ رام پور میں اپنے پھوپھا فضل حسن خاں کے یہاں مقیم ہو کر داغؔ کے شاگرد ہوئے اور شاعری میں مہارت حاصل کی۔ داغؔ ان پر بہت مہربان تھے اور ان کو پیارے شاگرد کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

مولانا حسن رضا خاں کی شادی خاندان ہی میں علیم اللہ خاں کی دختر اصغری بیگم سے ہوئی تھی۔ آپ کے تین فرزند تھے حکیم حسین رضا خاں، علامہ حسنین رضا خاں اور فاروق رضا خاں۔ آپ کی نسل حکیم حبیب رضا خاں اور حسنین رضا خاں سے چلی۔ حسنین رضا خاں کے فرزند علامہ سبطین رضا خاں آج کل رشد و ہدایت میں مصروف ہیں۔ باقی فرزند علامہ تحسین رضا خاں اور حبیب رضا خاں علی الترتیب صاحب علم و فضل حال و قال احوال و اشغال میں اپنے اسلاف کا مکمل نمونہ ہیں اور مرکزی دارالافتاء سوداگران بریلی سے منسلک ہیں۔

مولانا حسن رضا خاں کے اپنے برادران سے تعلقات انتہائی مشفقانہ تھے۔ آپ امام احمد رضا خاں کے دست راست تھے۔ دارالعلوم منظر الاسلام کے پہلے مہتمم بھی آپ ہی تھے۔ آپ کے دور میں دارالعلوم عروج پر پہنچا۔ امام احمد رضا فاضلِ بریلوی کی علمی مشغولیت اور دینی خدمات میں انہماک مقتضی تھا تاکہ یکسوئی سے آپ تجدید دین اور تحفظ ناموس پر رسالت کے فریضے کو انجام دیتے رہیں۔ جاگیرداری کا کام مولانا حسن رضا خاں کے ذمہ آیا۔ جس کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ گھر کے تمام انتظامات شادی بیاہ وغیرہ بھی آپ کے ذمہ تھے۔

مولانا حسن رضا خاں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک جید عالم باعمل صاحبِ تقویٰ اور عابد کے علاوہ قادر الکلام شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ مولانا حسرت موہانی آپ کی تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ کی ابتدائی چھ کتابیں زمانۂ حیات میں چھپ کر مقبول خاص و عام ہو چکی تھیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ آپ نے اپنے اندازِ سخن کو استاد (داغ) کے رنگ کلام سے اس قدر مشابہ کر دیا تھا کہ اکثر داغ اور حسن رضا کی شاعری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مولانا نے انتہائی مصروف زندگی گزاری۔ جاگیر کا انتظام و انصرام گھریلو سامان و اسباب کی فراہمی، دار العلوم منظر الاسلام کے اہتمام کے علاوہ تصنیف و تالیف میں شغف گویا آپ کی شخصیت ہم گیر اوصاف کی حامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی عظیم اور گوناگوں ذمہ داریوں کو تا حیات ظاہری ادا کیا کبھی برادران کو کوئی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اور نہ ہی کبھی حرفِ شکایت زبان پر آیا۔ امام احمد رضا خاںؒ فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

> ''اعلیٰ حضرت نے جب بی بی صاحبہ کے الفاظ سنے تو وفور مسرت سے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ حسن میاں (مولانا حسن رضا) تم نے مجھے دنیا سے بالکل بے نیاز کر دیا۔ میری بیٹیوں کی شادیاں ہیں میں ان کا باپ ہوتے ہوئے بالکل بے خبر اور آزاد بیٹھا ہوں۔ تم نے مجھے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ دی کہ جہیز میں کیا کیا دیا جائے گا۔ اور کہاں کہاں

سے فراہم ہوگا آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ حسن میاں جو کچھ میں دین کی خدمت کررہا ہوں اس کے اجر میں باذن اللہ حصّہ دار تم بھی ہو۔ اس واسطے کہ تم ہی نے مجھے خدمات کے لیے دنیا سے آزاد کردیا ہے۔''

(سیرتِ اعلیٰ حضرت صفحہ ۶۵ (۵) ماہنامہ)

حکیم سید برکت علی نامی بریلوی ''تذکرہ مختصر'' میں مولانا حسن رضا خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ اپنے پدر بزرگ اعلیٰ حضرت امام العلماء حضور سیدنا مولوی نقی علی خاں صاحب قدس سرہ العزیز کے خزائن علم وفضل کے مستفیض تھے اور جواہر معانی وفضل سے بہرہ ور تھے..... علاوہ بریں بریلی میں اپنے اخی معظم مرکز دائرۂ علوم، مجدد، ماۃ حاضرہ، عالمِ اہلِ سنت مولانا مفتی جناب محمد احمد رضا خاں صاحب کی فیضِ معنوی حاصل کیا۔''

شعر وسخن کا شوق مولانا کو ابتدا ہی سے تھا۔ کچھ روز تک بہ طور خود مشق کرتے رہے۔ اس کے بعد مرزا داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا اور ایک مدت تک رامپور میں رہ کر استاد کے گلشن سخن سے گل چینی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ بجائے خود استاد مستند قرار پائے۔ بریلی کے اکثر خوش گو شاعروں کو آپ ہی کے دامنِ کمال سے وابستہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ چند نام آپ کے دیوان عاشقانہ ونعتہ کے آخر میں درج ہے! جیسے سید برکت علی نامی، منشی دوارکا پرشاد، حلیم بریلوی، وہاج احمد محشر،

سید محمود علی عاشق، منشی ہدایت یار خاں قیس، منشی اختر حسین اختر، برج موہن، کشور فیروز، منشی مظہر حسین مظہر، سید مسعود غوث فیض، تہور علی تہور، اثر بدایونی، اعجاز احمد قیصر مراد آبادی، انہوں نے قطعات تاریخ لکھے ہیں۔ وہ جب تک زندہ رہے اقلیم شاعری ان کے قبضے میں رہی۔ آپ نے داغ کے اسلوب کو فروغ بخشا۔ آپ کے ذریعہ مشاعروں نے زور پکڑا اور بریلی میں محلہ معماران کا امام باڑہ مشاعروں کا مرکز بن گیا۔ اس عمارت میں استاد داغ کی صدارت میں بھی مشاعرہ ہوا۔

مولانا حسن رضا کے زمانہ میں نعتیہ مشاعروں کا رواج قائم ہوا اس سے قبل بریلی کے مشاعروں میں بطور ہدیہ تبرک حمد و نعت منقبت خوانی ہوتی تھی۔ مولانا نے نعت گوئی کو ہندستان گیر حیثیت دلوائی یہاں تک کہ غیر معمولی مقبولیت کے باعث نعت گوئی کے الگ مشاعرے بھی منعقد ہونے لگے۔ آپ کے زمانے سے مشاعروں میں مزاح نگاروں نے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا تھا۔ آپ سے ایک ہزل گو خنداں وابستہ تھے اور حکیم عبد الصمد سرشار سے ایک سقہ جن کا تخلص فلفل تھا۔ مشاعروں میں ہر دو گروپوں کی طرف سے یہ ہزل گو پیش ہوتے اور سامعین کے لیے انبساط کا سامان فراہم کرتے۔

مولانا حسن رضا خاں عالمِ دین اور منقولات و معقولات کے منتہی تھے۔ ان کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ متقی و پرہیز گار انسان تھے۔ انہوں نے شاعری کو وسیلہ رزق و ذریعہ شہرت نہیں بنایا تھا۔ وہ درباروں سے بھی غیر متعلق تھے۔ وہ نہایت خود دار اور تہذیب نفس کی دولت سے مالا مال شاعر تھے لہذا داغ کی تقلید میں غزلیں لکھتے وقت انہوں نے اپنے علم و فضل اپنے اتقا، خودداری و تہذیب نفس کے نور

کی چادر مرمریں مجسمے پر ڈالی۔ یہ اعلیٰ فنکاری امیرؔ مینائی کے شاگردوں میں حفیظ جونپوری کی تھی اور دوسری طرف داغ کے شاگردوں میں حسن رضا خاں کی تھی۔ ان کے دیوان کا نام ''ثمرِ فصاحت'' ہے۔

حسنؔ بریلوی نے داغؔ کی سوقیت دور کی۔ زودگوئی کے باوجود غزل کو برقرار رکھا۔ اظہار حدیث خلوت، خمریات، شوخی اور دیگر مضامین غزل کو باندھنے کے باوصف استاد کی تقلید میں ایک دائرے میں مقید نہیں ہوئے۔ انہوں نے دل کی فطری کسک اور قلب کے نور کو بھی اپنی غزل میں پیش کیا۔ وہ فطری طور پر غزل کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہونے کی وجہ سے باعمل زندگی گزارنے اور شعر گوئی کی فطری صلاحیت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ نعت لکھتے۔ چنانچہ انہوں نے نعت گوئی میں بھی امتیاز پایا۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ مسمیٰ ''ذوقِ نعت'' ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا جس کے اب تک متعدد ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام اور نعتیہ غزلیں برصغیر ہند و پاک میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ نعتیہ کلام پر داغؔ کی اصلاح نہیں۔ بلکہ ان کے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں نے اصلاح دی۔ وہ ان کی نعتوں کے مداح تھے۔ انہوں نے اپنے ملفوظات میں دو نعت گویان اردو یعنی کافیؔ مرادآبادی اور حسنؔ رضا کی تعریف کی ہے۔ فرمایا "نعت لکھنا پل سراط پر چلنے کے مترادف ہے اگر مدح میں غلو کیا تو گمراہ ہوا اگر مدح میں کمی کی تو بھی گمراہ ہوا" حسنؔ بریلوی کی نعتوں میں شرعی نقص نہیں ملتا ہے۔ ان کی نعتوں میں غزل کا آہنگ اور چٹخارہ ملتا ہے۔

مولانا حسنؔ رضا عاشقِ رسول تھے۔ بقول ان کے صاحبزادے مولوی حسنین

رضا خاں رسول مقبول کا نام گرامی آتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد جو وفات سے سات ماہ قبل ہوا تھا، آپ نے ذوقِ نعت مرتب کیا۔ ''ذوقِ نعت'' میں تین مثنویاں بھی ہیں یعنی ''وسائل بخشش (۱۸۹۱) ''ذکرولادت شریف'' اور ''بے نام اور نا تمام''۔ ان میں وسائل بخشش زیادہ مقبول ہے۔ وہ ۱۶۰۲۵ اشعار پر مشتمل ہے۔

مولانا حسن بریلوی کا نام اردو صحافت میں بھی کافی معروف ہے۔ انہوں نے دینی موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں اور تحریک ردِ وہابیت اور متنازعہ مسائل فقہ و عقیدہ میں اپنے برادرِ محترم اعلیٰ حضرت کے پر جوش معاون و مددگار رہے۔ انہوں نے اپنے مکان کے قریب محلہ سوداگران میں مطبع اہل سنت قائم کیا۔ جہاں ان کے دواوین غزل و نعت بھی شائع ہوئے۔ ان کی نگرانی میں ''بہارِ بے خزاں'' اور ہفتہ وار ''روزِ افزوں'' بھی جاری ہوا۔ ان ماہوار اور ہفتہ وار رسالوں میں پاکیزہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اور غزل و نعت بھی پابندی سے چھپتی تھیں۔ ''روز افزوں'' اخبار کا اشتہار بہارِ بے خزاں میں چھپا تھا۔ جس کی عبارت یہ ہے:

> ''اخبار روز افزوں'' نے ملک میں اپنی روزافزوں ترقی ۱۹۰۲ء سے نہایت مستعدی کے ساتھ حمایتِ مذہب اور پولیٹیکل معاملات پر اپنی رائے آزادانہ ظاہر کر کے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ہم اس کی نسبت ناظرین والا تمکین کی خدمت میں صرف اس قدر عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ کو ایسا اخبار دیکھنے کا شوق ہے۔ جو بچوں کا دوست، جھوٹوں کا دشمن، قوم

کا خیر خواہ، گورنمنٹ کا مشیر رعایا کے حقوق کا دستگیر ہو تو شہر بریلی کا مشہور اخبار روز افزوں ہفتہ وار دیکھئے۔ جس میں ہر شخص کی طبیعت کا عمدہ سامان موجود ہے۔ اگر آپ کو فاضلانہ مضامین پڑھنے کا شوق ہے تو ایڈیٹوریل مضامین ملاحظہ فرمائیں۔ اور اگر آپ کو علم دین اور مسائلِ شرعیہ سے دلچسپی ہے تو مذاکراۂ علمیہ سے آپ کی پوری تسکین ہو سکتی ہے۔ اگر آپ خبروں کے شائق ہیں تو عطر مجموعہ اور جام جہاں نما کی سیر کیجئے۔ اگر آپ کو شعر وسخن سے دل بستگی ہے تو نامی گرامی شعرائے زمانہ کا کلام جو نہایت حسن انتظام سے شائع کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔''

اس زمانہ میں یہ اخبار بہت ہی دلچسپ تھا۔ کیونکہ اس میں ہر شخص کی طبیعت کا عمدہ سامان موجود تھا۔ اس اشتہار سے حسن رضا خاں اور ان کے شاگرد، مہتمم اور ایڈیٹر محمود علی عاشق کی ذہانت وسیع النظری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گویا مولانا صرف شاعر و عالمِ دین ہی نہ تھے بلکہ دنیا کا پختہ تجربہ رکھنے والے صحافی بھی تھے۔

مولانا کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف جید عالم، قادرالکلام شاعر تھے بلکہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثر میں الفاظ کی بازیگری نہیں ملتی ہے وہ اپنی بات کو اس خوبی سے الفاظ کا پیراہن پہناتے ہیں کہ قاری اسے پڑھ کر اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اردو نثر و نظم میں آپ کی یادگار تصانیف حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین

۲. نگارستان لطافت و ذکر میلاد شریف

۳. بے موقع فریاد کا جواب در مسئلہ قربانی

۴. آئینۂ قیامت ذکر کربلا معلیٰ

۵. دین حسن در حقانیت اسلام

۶. وسائل بخشش ذکر کرامات غوث اعظم

۷. قہرالدیان علی مرتدِ بقادیان

۸. ذوقِ نعت

۹. ثمرِ فصاحت

۱۰. قند فارسی کلام

۱۱. صمصامِ حسن

۱۲. بردار برفتن

۱۳. ندوہ کی روداد سوم کا نتیجہ

بقول حسرت موہانی آپ کی ابتدائی چھ کتابیں آپ کے زمانہ حیات میں چھپ کر قبول خاص و عام ہو چکی تھی۔

مولانا نے ادبی اور مذہبی دونوں خدمات انجام دیں دینی ومذہبی خدمات زیادہ غالب رہیں۔ جس کے باعث آپ کی ادبی شخصیت دب کر رہ گئی۔ بحیثیت ادیب آپ نے زبان و بیاں اور علم و داب کی جو نثری خدمات انجام دیں ہیں وہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ ان کی تحقیقی صلاحیت عالمانہ وقار اور ناقدانہ بصیرت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔

مولانا حسن رضا کی شاعری کے بارے میں مختلف ناقدین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ حسرتؔ موہانی کی رائے پچھلے صفحات میں درج ہے۔ مولانا احسنؔ ماہروی جو داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے فرماتے ہیں۔

کہ وہ شہر خموشاں میں ہیں باتیں رہ گئی ان کی
انہیں باتوں کو حاصل اب حیاتِ جاودانی ہے
وہ باتیں سربسر گویا سخن سنجوں کی باتیں ہیں
کہ جن میں عاشقانہ رنگ کی شیریں زبانی ہے
انہیں باتوں سے باتوں باتوں میں یہ بن گیا دیواں
کہ جس کی ہر غزل سرمایہ دار خوش بیانی ہے
چست بندش صاف معنی شوخ مضموں نیک فکر
کیوں نہ ہو پھر خوبیوں میں ایک دیوانِ حسنؔ

جن شاعروں ودانشوروں نے مولانا حسنؔ بریلوی کی شاعری پر تبصرے کئے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حسنؔ بریلوی کے یہاں ندرت معنی و مضمون ہے۔ بندش کی ترتیب میں جدت کی پنہائیاں ہیں۔ مولانا موصوف کو خاقانیؔ و بیدلؔ سے تعبیر کرنا۔ ان کی شاعری میں غالبؔ کی بلاغت اورؔ مومنؔ کے رنگ کا پایا جانا۔ امیرؔ مینائی کے مضامین اور زبان داغؔ کی موجودگی اس بات کا احساس دلا رہی ہے کہ مولانا کی ذات مجمع صفات ہے ان کی شاعری میں ندرت فکر، حسن معنٰی، جدت مضامین اور نادر و نایاب، رمز و کنایات ہیں۔ ان میں دلکشی وصفائی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا حسنؔ رضا بریلوی کی شاعری نثر نگاری اور اسلوب

پر بیشتر ادب کی تاریخوں اور تذکروں میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ داغ کے شاگردوں پر مشتمل مستقل تنقیدیں دیکھنے کو ملی لیکن ان کے "پیارے شاگرد" کو نظر انداز کردیا گیا ہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ کمی ضرور محسوس کی جاتی ہے کہ مولانا کا ذکر ان کی غزلوں کے حوالے سے نہیں ہوا ہے۔ مولانا ایک مذہبی انسان تھے اور ان کا تعلق سبھی مسلمانوں کے مذہبی عقائد رکھنے والے جید عالموں کے گھرانے سے تھا۔ سرسید، محمد حسین آزاد، شبلی اور حالی وغیرہ کی اردو نثر میں جو خدمات ہیں مولانا اپنے اسلوب اور انفرادی طرز فکر میں ان سے کم نہیں ہیں۔ جہاں تک اردو میں نعت گوئی کا تعلق ہے شاعری کی اس صنف کو پروان چڑھانے میں اردو کا کوئی بھی شاعر مولانا حسن رضا کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اردو نعت گوئی کو غزل کا آہنگ دیا۔ غزل کی فکر اور ہیئت عطا کی۔ مولانا کی نعت گوئی کی وجہ سے اردو شاعری میں نعت کی صنف معتبر کہلائی۔ مولانا قادرالکلام شاعر تھے۔ نعت ومنقبت، خمریات، قصیدہ اور رباعی و مثنوی جیسی اصنافِ سخن میں انہوں نے خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے معروف محقق قاضی عبدالودود نے ایک جگہ حسن بریلوی کے بارے میں لکھا ہے۔

حسن بریلوی نعت کے بہترین شاعر تھے۔ مولانا کا ضخیم نعتیہ دیوان ہر صنف سخن کی طبع آزمائی اور فنی عظمتوں سے معمور نظر آتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے ان کے بعض قابلِ قدر جدید ہیتی تجربوں اور فنی پیکروں نے دنیائے نعت کو ایک دورِ زریں سے روشناس کرایا ہے اور وسیع امکانات پیدا کیے ہیں۔ معنی خیزی، مضمون آفرینی اور فکری بلندیوں کو تابانیوں سے مجلّٰی کرکے اپنی آواز کو ممتاز بنایا۔ ایک طرف عظمتِ رسالت، اظہار معصیت التجائے مغفرت اور احساسِ ندامت جیسے

حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی شاعری کا حق ادا کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف عمیق معنویت، فنی تہہ داری، فصاحت و بلاغت اور لطیف طرز اسلوب پر بھی خصوصی زور دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مضمون آفرینی کا وقار بہت اعلیٰ ہے۔ ان کی شاعری کا یہ وصف نمایاں اور اہم ہے۔ داخلی محرکات وکوائف میں غضب کی بے ساختگی ہے۔ تقدس مآب مشاہدات وتخیلات کو ترتیب دے کر بڑی آسانی سے اشعار کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان ہی سے آمد کا بہاؤ ہے۔

ڈاکٹر امجد بدایونی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "داغؔ دہلوی نے اپنے شاگرد حسنؔ بریلوی کو نعتیہ شاعری سے متاثر ہو کر کہا کہ اگر میں نعتیہ شاعری کرتا تو حسن کو اپنا استاد بناتا"۔ داغؔ دہلوی مولانا حسنؔ رضا کی بہاریہ شاعری کے بھی بہت مداح تھے۔ اور اپنے تلامذہ میں انہیں سرِ فہرست رکھتے تھے۔ ان کی بہاریہ شاعری خرافات وخرابات سے پاک ہے۔ [8]

علامہ ظفر الدین بہاری نے اپنی کتاب اعلیٰ حضرت میں ایک حکایت نقل کی ہے، کہ جب مولانا حسن رضا بریلوی پیدا ہوئے تو ان کے دادا جو جید عالمِ دین تھے، نے دیکھ کر فرمایا کہ میرا یہ بیٹا مستان ہوگا۔ قول بہم ثابت ہوا۔ عشق رسالت میں ڈوبی ہوئی نعتیہ شاعری سے حضرت حسن خود بھی مست ہوئے اور دوسروں کو بھی مست اور بے خود فرماتے رہے۔

مولانا حسنؔ بریلوی نے جملہ علوم متداولہ کی تعلیم وتکمیل اپنے والد مفتی نقی علی خاں کے پاس کی۔ مگر زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں محدث بریلوی سے حاصل کیا اور ارادت وسلوک کی تعلیم سیدہ احمد نوری

میاں سے پائی.کی۔

آپ نے شعر و شاعری کا آغاز بچپن ہی سے شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد سے کر دیا تھا۔ مگر ابتدا میں آپ کو عشق مجازی یعنی غزلیات کا چسکا لگا ہوا تھا۔ اس لیے صنفِ غزل ہی میں شعر کہتے تھے۔ اور اصلاح مشہور زمانہ شاعر داغؔ دہلوی سے لیتے تھے۔ ایک مدت تک غزل کہتے رہے۔ اور ایک دیوان مکمل کیا۔ جس کا نام ''ثمرِ فصاحت'' ہے آپ کا شمار داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہونے لگا۔ حسرتؔ موہانی نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''شاگردان مرزا داغؔ دہلوی میں حسنؔ مرحوم بریلوی کا پایہ شاعری بہت بلند تھا۔ وہ بجائے خود استاد مستند تھے۔''

(انتخاب سخن حسرتؔ موہانی ص ۹۱)

مگر جب آپ کی طبیعت اس صنف میں شعر کہتے کہتے بھر گئی اور آپ اس کی کم مائیگی اور کھوکھلے پن سے آگاہ ہوئے تو آپ نے سرمدی سرمایہ حمد و نعت کی طرف اپنے قوتِ فکر کو موڑا اور داغؔ کے بجائے اپنے برادرِ کلاں حضرت بریلوی سے اصلاح لینے لگے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

بھلا ہے حسنؔ کا جنابِ رضا سے
بھلا ہو الٰہی جنابِ رضا سے
(حسنؔ بریلوی)

نعتیہ شاعری کے موضوعات داغؔ کی شاعری میں ناپید ہیں۔ وہاں تو شراب و کباب اور عشوۂ و غمزہ و ادا ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے رہتے ہیں جن کے رنگ

داغ کے ایک اور عزیز شاگرد ڈاکٹر اقبال کے کلام میں بھی در آئے ہیں۔ حسن رضا بریلوی کی طبیعت جب نعت گوئی کی طرف راغب ہوئی تو داغ کی جگہ فاضل بریلوی کو اپنا استاد تسلیم کرنا بہتر سمجھا اور نعتیہ کلام کی اصلاح اعلیٰ حضرت سے لینے لگے۔ انہوں نے حسنؔ بریلوی کی شاعری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف اور تائید و تصدیق فرمائی ہے اعلیٰ حضرت حسن رضا بریلوی کی انشاء پر دازی کے بھی قائل تھے۔ فرماتے ہیں۔

> ''کئی مسائل لینے (مجھ سے) پوچھا کہ محرم کی مجالس میں جو مرثیہ خوانی ہوتی ہے سننا چاہیے یا نہیں آپ نے فرمایا مولانا شاہ عمر عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتابیں جو عربی میں ہیں یا میرے بھائی حسن میاں مرحوم کی کتاب آئینہ قیامت میں صحیح روایات ہیں انہیں سننا چاہیے۔ باقی غلط روایات کے پڑھنے سے نہ پڑھنا اور نہ سننا بہتر ہے۔''

(ذوقِ نعت صفحہ ۴)

مولانا حسنؔ بریلوی کو تصنع سے سخت نفرت و گریز تھا۔ انہوں نے نیچری چیزوں کو بروئے کار لانے کی انتھک کوششیں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اور نثری تحریریں پر مغز اور پر اثر ہیں۔ مولانا کی ادبی خدمات سے انکار ممکن نہیں بلکہ اسی طرح ان کی طبیعت کی بالیدگی میں مذہبیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دینی ادارہ دارالعلوم منظر اسلام کو پروان چڑھانے میں انکا بڑا ہاتھ ہے۔ بریلی کا مطبع اہل سنت و جماعت کی تاسیس کا سہرا بھی آپ کے سر ہے۔ جس میں آپ کی متعدد

تصانیف اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ جن کی تعداد ۷ ہے، لیکن کچھ لوگ گیارہ بھی شمار کرتے ہیں۔ جو زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ڈاکٹر سید شمیم گوہر نے بھی آپ کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد گیارہ بتائی ہے آپ کی بعض تصانیف خاص و عام میں کافی مقبول ہوئیں۔ اس کا اندازہ ذوقِ نعت سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس کے ہندستان اور پاکستان میں تقریباً پچیس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں انہیں سے ان کی تحریروں کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا حسنؔ رضا بریلوی کے تلامذہ کی فہرست لمبی ہے اور اس میں اختلاف بھی ملتا ہے۔ مگر شعر و سخن میں مرید احمد چشتی نے مولانا حسنؔ بریلوی کے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے ان میں اور سید لطیف حسین ادیب کی تصنیف ''تذکرہ نعت گویاں بریلوی'' میں تحریر تلامذہ میں فرق ہے۔ حضرت کی شاعری کا اندازہ ۱۹۵۶ء کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب بابو پورہ کانپور میں محرم شریف کے موقع پر مرثیہ خوانی کا ایک بہت بڑا انعامی مقابلہ ہوا۔ جس میں شیعہ اور سنی دونوں حضرات نے حصہ لیا۔ انعام کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک شیعہ عالم کو مقرر کیا گیا کرنیل گنج کانپور کا ایک لڑکا محمد ہارون حشمتی جو ایک کامیاب نعت خواں تھا۔ اس نے بھی اس مقابلہ میں اپنا نام لکھوا دیا۔ اور اس نے حسنؔ بریلوی کا مرثیہ۔

باغِ جنت کے ہیں بہر مدح خوان اہلِ بیت
تم کو مژدہ نار کا اے دشمنانِ اہلِ بیت

پڑھا تو اسے اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ اس واقعہ سے مولانا حسنؔ بریلوی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پچھلی سطور میں لکھا گیا کہ مولانا حسن رضا خاں بریلوی بھارت کے شہر علم وفن بریلوی شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی دولت سے مالا مال تھا۔ خاندان کے لوگوں کو شعروادب خصوصاً نعت گوئی سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ بھی ابتدائی عمر ہی سے شعروشاعری کا شوق رکھتے تھے۔ آپ نے خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے علومِ دینیہ کی طرف توجہ فرمائی اور والدمکرم علامہ نقی علی خاں بریلوی اور بڑے بھائی حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی سے علومِ دینیہ کی تکمیل کی۔ شاعری کے شوق کے سنِ شعور کو پہنچنے پر فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاگردی میں چلے گئے۔ اور وہاں اپنے ذوق کی تکمیل کی۔ شروع شروع میں غزل ومثنوی، رباعی، تاریخ، قصائد، مناقب غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ غزل گوئی میں آپ نے مرزا داغ دہلوی کی صحبت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور بہت جلد اپنا ایک مقام بنا لیا۔ داغ دہلوی کو آپ سے ایک خاص انس تھا۔ وہ پیار میں آپ کو پیارِ شاگرد کہہ کر پکارتے تھے۔ چنانچہ حسن بریلوی ایک جگہ خود فرماتے ہیں۔

پیارے شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزا کہیے

غزلوں پر مشتمل آپ کا دیوان ''ثمرِ فصاحت'' ۱۹۱۰ء میں مطبع اہل سنت بریلی سے شائع ہوا۔ جس زمانے میں آپ نے شاعری میں قدم رکھا اسی زمانے میں مقبول صنف شاعری بامِ عروج پر تھی۔ حسن بریلوی نے بھی مروجہ روش کے مطابق اپنی شاعری کی ابتدا غزل ہی سے کی۔ پھر آپ برادرِ مکرم کی صحبت کے زیرِ اثر نعت گوئی

کی جانب مائل ہوئے۔ گویا بارگاہ رسالت سے لطف و کرم کے سائل ہوئے ؎

کھیل بگڑا، ناؤ ٹوٹی میں چلا
اے مرے والی بچا فریاد ہے

جلدی بلاوا آگیا اور آپ نے اپنے عیال کے ساتھ حج بیت اللہ شریف اور زیارتِ درِ حبیب سے ہمکنار ہوئے۔ واپس لوٹے تو دنیا بدل چکی تھی اور آپ صرف مدینہ اور تاجدارِ مدینہ کے ہو کر رہ گئے۔ یادِ مدینہ، حسرت مدینہ اور رفعت و شان مدینہ کو حسنؔ بریلوی اپنے دل کی زبان سے یوں بیان کرنے لگے ؎

عجب رنگ پر ہے بہار مدینہ
کہ سب جنتیں ہیں نثار مدینہ
رگ گل کی جب نازکی دیکھتا ہوں
مجھے یاد آتے ہیں خار مدینہ
رہیں ان کے جلوے بسیں ان کے جلوے
مرا دل بنے یادگارِ مدینہ

آپ کا شمار نعت گو شاعر کے علاوہ اپنے وقت کے معروف علماء دین میں بھی ہوتا ہے۔ آپ نے تبلیغِ دین کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اور باطل فرقوں کے خلاف نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا۔

مولانا حسنؔ بریلوی اپنے علاقہ کے ایک بڑے زمیندار بھی تھے۔ معاشی طور پر فارغ البال تھے۔ آپ بہت ذہین تھے۔ اور طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شگفتگی اور زندہ دلی ان کی شخصیت کے اہم پہلو تھے۔ آپ کا خاندان تو علم و فضل

تقوی، پرہیز گاری، حریت پسندی اور ولائے رسول میں مقبول تھا ہی۔ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی بہت بڑے عاشقِ رسول اور زمانے کے مجدد تھے۔ آپ بھی خدا پرستی اور سرکار مدینہ سے عشق ومحبت واتباع رسول میں مشہور تھے۔ مولانا منور حسین سیف السلام ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''حضرت حسن بریلوی کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ مسجد کے سامنے ایک بڑا مضبوط لکڑی کا موٹا تختہ چار لوہے کے پاؤں پر رکھا ہوا تھا۔ یہ عام سڑک تھی۔ اس پر حسن بریلوی تشریف رکھتے تھے۔ جب کسی مسافر یا راہ گیر کو غریب یا مجبور سمجھتے تو اس کا حال دریافت کرتے اور اس کی امداد فرماتے۔ غریبوں اور بیواؤں سے کرایہ وصول نہیں کرتے تھے۔ نماز ایسے خلوص سے پڑھتے کہ اکثر اوقات ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ جب مسجد سے تمام نمازی چلے جاتے تو آپ بعد میں مسجد سے نکلتے۔ اگر کوئی مسافر نظر آتا تو اپنی بڑی بیٹھک میں نہایت آرام سے جگہ دیتے۔ بیٹھک میں اچھے خاصے پلنگ بستروں سمیت اور بیٹھنے کے لیے مونڈھے بھی رکھے ہوئے تھے۔ نماز اشراق چاشت اور تہجد کے پابند تھے۔ ان کا خاندان مہمان نوازی اور فیاضی میں بھی مشہور تھا۔ آپ مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔ مہمان کو اپنی طرف سے کچھ نقدی بھی پیش کرتے تھے۔

پھر رخصت ہونے پر تقریباً ۳۷ نادر و نایاب کتب کے مسودات (عکسی) تحفۃً عنایت فرماتے۔''

حسنؔ بریلوی تاریخ گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے انہوں نے کئی بزرگوں کے مادہ ہائے تاریخ وفات برجستہ نکالے ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد داغؔ دہلوی کے انتقال پر جو تاریخ وفات کہی اس کا مطلع و مقطع درج ذیل ہے ؎

گئے جنت کو حضرت استاد
غمِ فرقت کا حال کیا کہیئے
مرگ استاد کی حسنؔ تاریخ
داغِ نواب مرزا کہیئے
۱۳۲۲ھ

مشہور نعت گو شاعر محسنؔ کاکوروی کی ''مثنوی شفاعت ونجات'' کی تاریخ یوں کہی ؎

حسنؔ اپنے محسنؔ کی ہو کچھ ثنا
جو احسانِ حسنؔ طبیعت کا ہو
شفاعت کا لکھا ہے احوال خوب
بیاں کیونکر اس کی فصاحت کا ہو
دعائیہ تاریخ میں نے کہی
یہ اچھا ذریعہ شفاعت کا ہو

اپنی کتاب ''نگارستان لطافت'' کی تاریخ طباعت اس طرح کہی۔

ہیں یہ سن تالیف فقیرانہ صدا میں
والی میں تصدق مجھے مدحت کی جزا دو

۱۳۵۲ھ

حضرت شاہِ آلِ رسول مارہروی کی تاریخ وفات کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے۔

اچھے کے پیارے میرے سہارے
باہر ہیں بیاں سے ان کے مناقب
میں نے کہی یہ تاریخ رحلت
قطب المشائخ اصل مطالب

۱۲۹۶ھ

حضرت حسنؔ بریلوی کا ۱۹۰۸ء میں وصال ہوا اور بریلی کے سٹی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

حضرت حسنؔ بریلوی کو ممتاز اہل علم و دانشور اور شعراء کرام نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اسعدؔ بدایونی نے ۱۹۸۵ء میں ''داغؔ دہلوی کے اہم تلامذہ کے عنوان سے ایم فل کے لیے مسلم یونیورسٹی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں حسن رضا خاں کی نعتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں لاہور کی ''مجلس سخن'' کے زیرِ اہتمام حسنؔ بریلوی کی یاد میں ایک کانفرنس ''تذکرہ نعت گستر'' کے نام سے منعقد ہوئی۔ جس میں موصوف کے فکر و فن پر مضامین اور مقالے بھی پڑھے گئے۔ ان کا نعتیہ کلام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ ''ماہنامہ نعت'' لاہور نے اپنے خصوصی نمبر'' حسن رضا بریلوی کی نعت'' شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء میں شاندار طریقے سے شائع کیا۔ ''ذوقِ

نعت پر ناقدانہ نظر کے عنوان سے مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی نے علامہ شمسؔ بریلوی کے مقالے آپ کے نعتیہ دیوان ''ذوقِ نعت'' میں شامل کر کے چھاپا ہے۔ لالہ سری رام نے اپنی کتاب ''خمخانہ جاوید'' میں حسنؔ بریلوی کا بھرپور اور بہتر انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''اردو کی نعتیہ شاعری'' میں ڈاکٹر نفیس سندیلوی نے رسالہ ''نگار'' کے ''داغ نمبر'' میں حسرتؔ موہانی نے اپنی تصنیف نکاتِ سخن میں اور نظیر لدھیانوی نے اپنی کتاب ''شعرِ سخن'' میں مولانا حسنؔ بریلوی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کی اور ان کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

اوپر مذکور ہے کہ نواب مرزا داغؔ دہلوی نے حسنؔ بریلوی کی نعتیہ شاعری سن کر کہا تھا کہ اگر میں نعتیہ شاعری کرتا تو حسنؔ کو اپنا استاد بناتا۔ وہ حسنؔ بریلوی کی بہاریہ شاعری کے بھی مداح تھے۔ ماہر القادری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''مولانا احمد رضا خاں کے چھوٹے بھائی مولانا حسنؔ رضا خاں بریلوی بڑے خوش گو شاعر تھے۔''

راجہ رشید محمود ایڈیٹر ماہنامہ نعت لاہور (پاکستان) لکھتے ہیں:

> ''حضرت حسن رضا بریلوی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ مشہور عالمِ دین اور بہت بڑے شاعر تھے........داغ دہلوی کے چہیتے شاگرد تھے۔ حسن رضا خاں مالکِ مختار دو عالمؐ کے ایک جلیل القدر مدحت نگار تھے۔ وہ ڈوب کر نعت کہتے تھے۔ ان کے قلب و جگر پر صاحب اختیار سید والا کی عظمت نقش تھی۔ حسن رضا بڑے پکے اور سچے مومن تھے۔ اور الفِ رسولؐ کے گیت دل کے ساز پر گاتے رہتے تھے۔

موت آجائے مگر آئے نہ دل کو آرام
دم نکل جائے مگر نکلے نہ الفت تیری

حزیں کاشمیری لکھتے ہیں:

''موصوف (حسنؔ بریلوی) زبان و بیان کی ان تمام باریکیوں سے کما حقہٗ واقف ہیں جو کسی بھی بڑے فنکار کے لیے ضروری ہیں۔ آپ کی نعت حشو و زوائد سے پاک ہے تنافر جلی و خفی نام کو بھی نہیں۔ قافیہ و ردیف کے جملہ رموز سے آگاہ ہیں۔ الفاظ کا درو بست مصرعوں کی سادگی اور چستی کے ساتھ ان کے کمال فن کا پتہ دیتا ہے۔ نہ کہیں جھول نہ ضعف خاتمہ، سلاست زبان، ندرت ادا کے عناصر کہیں دور گہرائیوں میں چھپے ہوئے جذبات میں گھل مل کر عجب سماں باندھ رہے ہیں۔ جیسے نعت کا یہ مطلع ۔

سر صبح سعادت نے گریباں سے نکالا
ظلمت کو ملا عالم امکاں سے نکالا

ماہنامہ نعت لاہور شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء پر ڈاکٹر اختر جعفری لکھتے ہیں۔

'' آپ نے نعت گوئی میں علم بیان اور صنائع بدائع کے استعمال کا التزام کیا ہے۔ آپ کی نعت میں صنعت تجنیس، صنعت، اشتقاق، صنعت تلمیح، صنعت تضاد اور صنعت مراعاۃ النظیر کا خوب صورت استعمال ملتا ہے۔ جس نے آپ کے

کلام کو چار چاند لگا دیئے ہیں ۔

آتا ہے فقیروں پہ انہیں پیار کچھ ایسا
خود بھیک دیں اور خود کہیں منگتا کا بھلا ہو

دے ڈالیے اپنے لبِ جاں بخش کا صدقہ
اے چارۂ دل، دردِ حسنؔ کی بھی دوا ہو

علامہ شمس الحسن شمسؔ بریلوی لکھتے ہیں:

''حسنؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہاں کی فضاء میں عشق رسول اور محبت نبی ان کو نصیب ہوئی وہ رسول مکرم کے ایسے گدائے غاشیہ بردوش تھے کہ کیا مجال ہے کہ سوئے ادب تو معاذ اللہ بڑی بات ہے۔ شان رسالت کے غیر شایان کلمات کی ادائیگی کس کی مجال تھی کہ ان کے حضور کر سکے۔ اس عظیم ہستی نے آداب نعت سے جناب حسنؔ کو واقف کیا۔ ظاہر ہے کہ جس استاد کی زبان کی دھوم تمام ہندستان میں تھی جناب حسنؔ کبھی ان آداب کو نہ بھولے۔ زبان کی لذت کے ساتھ شائستگی گفتار اور انداز بیان ملاحظہ ہو

جلوۂ یار ادھر بھی کوئی پھیرا تیرا
حسرتیں آٹھ پہر تکتی ہیں رستا تیرا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مولانا احمد رضا کے چھوٹے بھائی حسنؔ رضا بھی صاحب

دیوان شاعر ہیں ۔ حسن رضا کا رنگِ سخن بھی تقریباً وہی ہے
جوان کے بڑے بھائی کا ہے ۔ دونوں بھائیوں کی نعتوں میں
جو چیز متاثر کرتی ہے وہ سادگی وصفائی بیان کے ساتھ ساتھ
ان کے جذبات عشقیہ کی وہ شدت ہے جو سید عالم ﷺ سے ان کی
والہانہ لگاؤ کے ثبوت ہر قدم قدم پر مہیا کرتی ہے۔

ڈاکٹر نفیس سندیلوی ماہنامہ نعت لاہور شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء میں صفحہ ۳۳۔۳۲
پر لکھتے ہیں:

''حاجی مولانا حسن رضا خاں کو شعر وسخن کا طبعی وفطرتی ذوق
تھا۔ غیر معمولی ذہانت وذکاوت کے مالک تھے۔ مزاج میں
شوخی، شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔ حضرت داغ کے ارشد تلامذہ
میں شمار تھا۔ نعتیہ کلام میں ان کا دیوان ''ذوقِ نعت'' یادگار
ہے۔''

''حکیم محمد موسیٰ امرتسری حسن رضا بریلوی کے کلام پر تبصرہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مولانا حسن رضا نے اپنی استادانہ
صلاحیتوں کو اپنے کلام میں خوب اجاگر کیا۔ امام احمد رضا
کے کلامِ بلاغت مقام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو نعتیہ کلام
میں ہونا چاہیے۔ لیکن حسن رضا کا اندازِ بیان نعت گو حضرات
میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو داغ کا غزل گو شعراء میں۔''

اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی ''شعر حسن'' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء میں حسن

رضا خاں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کے کلام کی بڑی خوبی مضمون آفرینی ہے۔ حسن رضا کی نعتوں میں ندرت خیال بھی ہے۔ اور حقیت آرائی بھی۔ حسنؔ نہایت موزوں و مناسب الفاظ اور برمحل محاورات کا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات نہایت لطیف اور عام فہم ہے۔ اس لیے ان کا کلام فصاحت اور بلاغت کا خزینہ بن گیا ہے۔''

باب دوم

عہد، معاصرین اور ادبی فضا

مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی ۱۸۵۹ء کو بریلی شریف میں پیدا ہوئے۔
یہ غدر کے بعد کا زمانہ ہے جب بہادر شاہ ظفر معزول ہو چکے تھے اور دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے سیاسی، سماجی، معاشی انتشار کا نسبتاً زیادہ شکار تھے۔ چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔ پورا معاشرہ زوال پذیر ہو چکا تھا۔ شریفوں اور محب وطن حضرات کا جینا محال تھا۔ لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اس غدر یا جنگِ آزادی کی لڑائی کے باعث جہاں ہندوستانی محقق جراحتوں کا شکار ہوا ہیں اس کے طفیل کچھ ہاتھ بھی آیا جسے ہم عقلیت پرستی کا رجحان کہہ سکتے ہیں۔ عرصہ حیات تنگ ہونے کی وجہ سے بیک وقت انھیں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی دنیا اور اس سے پیدا شدہ نت نئے معاشی اقتصادی، سماجی اور معاشرتی مسائل کی نوعیتوں کو سمجھنے کی کوششیں کی گئی۔ اس شعور کو عام کرنے میں شعرا و ادبا کا بڑا ہاتھ ہے۔ ادب چونکہ انسانی زندگی کی تخلیقی ترجمانی اور تہذیبی

زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ادب اور زندگی کا رشتہ بڑا گہرا اور مستحکم ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز کی تصویر ادب میں اور ادب کے اثراتِ زندگی پر بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں اس طرح ادب میں بھی زبردست تبدیلیاں ہوئیں ۔ اور ادب میں محض خیالی پرواز کے بجائے حقائق کی عکاسی اور فکر و نظر کی ترجمانی نظر آنے لگی ۔ حسن و عشق اور گل و بلبل کی داستان سرائی جو اردو ادب کا شیوہ تھا، کی جگہ حقیقت نگاری و حقیقت پسندی اور اصلاح معاشرہ کی طرف شعوری کوششیں کی گئی ۔ اس کے علاوہ حکمراں قوم کی وساعت سے یوروپ کے علوم و فنون عام ہوتے گئے ۔ مغربی ادب کے توسط سے نئے نئے تجزیے شروع ہو گئے ۔ اور موضوعات نے اس دور کے ادیبوں کو اظہار بیان کے لیے پیرایۂ بیان کی تلاش و جستجو پر مجبور کیا ۔ اس طرح انیسویں صدی کے نصف آخر کو جدید ادب کے ارتقاء کا دور کہا جا سکتا ہے ۔ شاعری اور تنقید اور ان کی اصناف میں زبردست تنوع نظر آنے لگا ۔

اس دور کے ادب کو انقلاب اور کسی حد تک اس کے ردِ عمل، معروضیت پسندی، نیچرل اور حقیقت نگاری کی ابتداء اور اس کے اثرات مرتب ہونے کا دور کہنا چاہئے ۔ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں میں بالخصوص غالب، سرسید، حالی، آزاد، نذیر احمد، شبلی، اکبر، اقبال اور چکبست وغیرہ نے اردو ادب کے خزانے کو نئے اصنافِ ادب سے مالا مال کر دیا ۔ روشن خیالی کے دروازے کھول دیئے ۔ سماجی سطح پر بڑھتے ہوئے متوسط طبقے کے وجود میں آنے اور غلبہ حاصل کر لینے کی وجہ سے ادب میں جیتی جاگتی سماجی حقیقتوں کو بھی پرخلوص انداز میں کہا جانے لگا ۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اس سمت جاں فشانی کر کے ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے اور عصری

تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی ہے بقول سرسید احمد خاں:

''زمانہ اور زمانے کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج
تبدیل ہوگئے ہیں''۔

(تہذیب الاخلاق)

اور حالی کہتے ہیں:

''ہر بات کا ایک عمل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں اب وہ وقت آگیا ہے عیش وعشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ لنگڑے اور بھاگ کا وقت یہی رہا۔ جو گنے کی الاپ کا وقت ہے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری)

محمد حسین آزاد بھی نئے حالات کی نزاکت سے واقف تھے کہتے ہیں:

''ملک ہمارا عنقریب آفرینش جدید کے وجود میں تھا اب تبدیلی کیا چاہتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں نئے نئے فنون ہیں سب کے حال نئے ہیں۔ ان کے خیال نئے ہیں۔ عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں راستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔''

(نیرنگِ خیال، دیباچہ)

بدلتے ہوئے حالات نے ہندستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو کو بھی نئی

راہ پر لا کھڑا کیا۔ ادیبوں شاعروں اور مفکرین کے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے طرز نئے تصورات اور نئے خیالات کو جگہ دی اور فکر وخیال کی اس جدت نے ادب کی اصناف میں تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ اردو نظم و نثر نے اس مطالبے کو بڑھ چڑھ کر پورا کرنے کی کوششیں کیں۔ اردو شاعری میں غزل کا طوطی بول رہا تھا۔ نئے موضوعات نئے اندازِ بیان اور ہیت مین تجربے ہوئے۔ اور عشق و عاشقی سے نکل کر غزل کے موضوعات میں زبردست تنوع آیا۔ اس کی اشاریت، رمزیت اور اسلوب کے پرانے رنگ پھیکے پڑ گئے اور اس کی جگہ قوس وقزح کے رنگوں نے لے لی۔ قصیدہ گوئی مرثیہ نگاری اور مثنویوں کے لئے دھیمی پڑ گئی۔ نظم نگاری کی طرف رجحان پیدا ہوا۔ اور نیچرل شاعری و حقیقت نگاری شاعروں کے مزاج کا حصہ بننے لگی۔

8

دوسری طرف مغرب کے زیر اثر نثر نگاری میں زبردست انقلاب آیا داستان گوئی سے ہٹ کر ہماری توجہ خصوصاً ناول نگاری، سوانح نگاری، مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی طرف مائل رہی۔ ہم نے اپنی تحریروں کے ذریعہ زندگی کو ادب سے اور ادب کو زندگی سے قریب کر دیا۔ سرسید احمد تحریک کے زیر اثر اردو نثر پروان چڑھی۔ نذیر احمد، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، محسن الملک و وقارالملک کے نثری کارناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ انہوں نے اردو نثر کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ عبدالحلیم شرر ناولوں کو نئی ہیت سے روشناس کراتے ہیں۔ انہوں نے تاریخی ناول لکھے جس میں ماضی کے مثالی کرداروں کو پیش کر کے

ہمت و حوصلہ کی تلقین کی۔ وہ سرسید کے حامیوں میں سے تھے اس لیے ان کے خیالات وافکار کو تقویت پہنچانے کے لیے ناول لکھے ان کی تحریروں کے ذریعہ ناول کے فن کو بھی فروغ ملا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں جنہوں نے معاشرتی ناول لکھے۔ فسانہ آزادان کا شاہکار ہے جس میں لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ اردو میں کردار نگاری کے فن کو برتنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ 'سیر کوہسار' اور 'جام سرشار' ان کے دوسرے ناولوں کے نام ہیں۔ یہاں مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان کا ذکر بھی اہم ہے جو اپنے فن کے اعتبار سے مکمل ناول ہے۔ اسے نفسیاتی ناول اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ناول کے ہر کردار کی داخلی زندگی کا بیان ملتا ہے۔ اسی عہد میں مزاحیہ ناولوں کی ابتداء ہوئی۔ منشی سجاد حسین کے حاجی بغلول، کایا پلٹ اور احمق الذی کافی مشہور ہیں۔ سرفراز حسین کے ''شاہد رعنا'' میں ایک طوائف کی زندگی کا بیان ملتا ہے۔ لیکن وہ امراؤ جان کے مقابلے کا ناول نہیں ہے۔

انیسویں صدی میں سوانح نگاری کا بھی آغاز ہوتا ہے اپنے عہد کے دو بڑے سوانح نگار حالی اور شبلی ہیں جنہوں نے متعدد سوانح لکھی ہیں۔ حالی کی حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی ہیں۔ شبلی نعمانی کو اردو ادب کا سب سے بڑا سوانح نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے الفاروق اور المامون لکھ کر اردو میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی، فرحت اللہ بیگ اور عبدالسلام ندوی کے نام بھی اردو کے اہم سوانح نگاروں میں لئے جاسکتے ہیں۔

خطوط نگاری کا آغاز غالبؔ کے خطوط کے ذریعہ ہو چکا تھا۔ جنہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا۔ ان کے خطوط اردو نثر کے ارتقاء میں اضافہ ہیں۔ شوخی، ظرافت، متانت، سنجیدگی ان کے خطوط کی خصوصیات ہیں۔ سرسید نے بھی خطوط کہے ہیں جس کی علمی، ادبی اور سماجی اہمیت ہے۔ شبلی حالیؔ کے خطوط کو بھی ادبی حیثیت حاصل ہے۔

اس دور کی سب سے اہم صنف مضمون نگاری ہے۔ مضمون نگاری اردو نثر کو سنجیدہ لہجہ اور قطعیت کے علاوہ سلاست روانی عطا کرتی ہیں۔ تعلیم وتربیت، مذہب اصلاح سماج، شاعری، سیاست تاریخ، ثقافت غرض انسانی زندگی سے متعلق تقریباً سارے اہم موضوعات اس میں آجاتے ہیں۔ سرسید کا ''تہذیب الاخلاق'' مضمون نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ محمد حسین آزادؔ، محسن الملک، وقارالملک، حالیؔ، شبلی، نذیر احمد، شررؔ غرض اس عہد کا ہر ادیب وشاعر مضمون نگاری کے ذریعے اردو نثر کو ایک نیا آہنگ نیا اسلوب دیتا ہے اور ادبی تخلیقی معیاری نثر کے فروغ میں حصہ لیتا ہے۔ مہدی آفادی نثر کے آہنگ میں استعاراتی رنگ لاتے ہیں۔ گوکہ انہوں نے کم لکھا ہے لیکن اپنے اسلوب وآہنگ کی وجہ سے اردو نثر میں ہمیشہ یادرکھے جائیں گے۔

ڈرامہ نگاری بعد کی پیداوار ہے۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری دھائیوں میں اس صنف نے اردو ادب میں اپنے قدم جما لیے تھے بیسویں صدی کے آغاز میں اسے کافی فروغ ملا۔ امانت کی اندر سبھا نے دھوم مچا دی تھی۔ اردو ڈرامہ کی اساس دیو مالائی تھی اس لیے اس پر زیادہ تر خیالی دنیا کا طلسم چھایا رہا اور ڈرامہ

حقیقی دنیا سے دور رہا۔ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے فنی صلاحیتوں کے حامل ہیں اس عہد میں محمد حسین آزاد، ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، عبدالماجد دریابادی دیتا تریہ کیفی کے نامِ گرامی مشہور ہیں جنہوں نے ادبی ڈرامے لکھے ہیں۔

ادب کو سمجھنے پرکھنے اور معیاری ادب تخلیق کرنا اور اس کو انسانی زندگی کا عکاس ہونا لازمی سمجھا گیا۔ چنانچہ اس کی ابتدا بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہوئی۔ حالی آزاد اور شبلی نے باقاعدہ ادب کو معیاری بنانے کے لیے شعوری طور پر کوششیں کیں۔ مقدمہ شعر و شاعری آبِ حیات، شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر اسی قبیل کی تحریریں ہیں۔ حالی شاعری کو محض دل بہلانے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ شاعری کی مقصدیت اور سماجی حقیقت کے قائل تھے۔ اصلاح اخلاق کو شاعری کے بنیادی مقاصد میں شمار کرتے تھے۔ ان کے خیال میں شاعری کے ذریعہ انسانی طبیعتوں کو نیکی، محبت اور مروت کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ شاعری کے لیے تخیل مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ شعر کے لیے سادگی اصلیت اور جوش ضروری سمجھتے ہیں۔ شبلی نعمانی نے اردو تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا فصاحت بلاغت اور صفائی بیان کے متعلق صحت مند محنت کی ہے۔ شعرالعجم کی چوتھی اور پانچویں جلدوں میں شبلی کے تنقیدی نظریات سامنے آتے ہیں۔ ان کے مباحث میں منطق ہے اس کا رجحان مشرقی نظریہ تنقید کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں صوری او رمعنوی تنقید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انہیں شاعروں کی سماجی اہمیت کا بھی احساس ہے۔ انہوں نے اردو میں نظریاتی تنقید کا آغاز کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری میں رومانوی عناصر کے رنگ گہرے ہیں۔ تخیل جذبہ، احساس، زبان کی رنگینی و

رعنائی ان کی تنقید کے لازمی عناصر ہیں۔ آبِ حیات کے علاوہ سخندانِ فارس اور نیرنگِ خیال سے بھی ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

حسبِ بالا سطور سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو نثر موضوع، مواد ہیت اور اسلوب کے اعتبار سے متنوع ہو جاتی ہے اور ترقی کے مختلف مدارج طے کر کے اپنے عہد ذریعہ میں داخل ہو جاتی ہے یہی وہ زمانہ ہے جب اردو شاعری بھی بام عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، اور بہادر شاہ ظفرؔ کے بعد حالیؔ نے اردو شاعری کو نئی نہج پر چلنے کا مشورہ دیا۔ اور خود بھی بامقصد شاعری کی۔ شبلی نے بھی خیال آرائیوں کے مقابلے میں معیاری شاعری کے خط و خال واضح کیے۔ نئی کھیپ میں روایت پرستی کے بجائے روایت پسندی کو ترجیح دیا۔ دہلی اور لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں سینکڑوں شاعر پیدا ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جب مغلوں کا چراغ گل ہو رہا تھا اُس وقت کے بڑے بڑے عالم اور شاعر جمع ہو گئے تھے جن کے دم سے اردو ادب کا یہ دور یادگار بن گیا ہے۔ متذکرہ شاعروں کے بعد اردو شاعری کے نسبتاً جدید دور میں اسیرؔ لکھنوی، امیر مینائی، داغؔ دہلوی اور جلالؔ لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں یہ جدید دور کے ہوتے ہوئے بھی قدیم رنگ کے شاعروں میں بڑے اہم ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کی جو خدمت کی وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ ہر کوئی زبان کی حقیقت اور شاعری کے اصولوں سے واقف تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے زمانے کے اثرات ان کے یہاں نمایاں نہیں ہیں۔ ان کے یہاں مغربی و مشرقی کشمکش نہیں ہے۔ یہ لوگ رام پور اور حیدرآباد کے درباروں سے متعلق رہے اور وہیں اپنے سیکڑوں شاگردوں کے ساتھ

دب کی خدمت کرتے رہے۔

امیر مینائی کے کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ اردو لغت پر بھی ان کا کام ہے۔ داغ دہلوی کے کئی دیوان نکلے۔ جلال نے دیوان کے علاوہ لغت اور زبان کے اصولوں پر بھی کتابیں لکھیں اور اسیر لکھنوی کے بھی کئی دیوان شائع ہوئے۔ (اس طرح ادب کا رنگ اپنی آب و تاب کے ساتھ باقی رہا۔) جدید دور میں حالی وغیرہ کے اثر سے غزل کی مقبولیت میں کمی آئی اور لوگ نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن غزل پھر بھی زندہ رہی اور نئے روپ میں نیا لباس پہن کر محفل کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ مبالغہ آرائی، قافیہ پیمائی اور رسمی خیالات کم ہو گئے۔ اور سچائی کے ساتھ دل کی باتیں لکھی جانے لگیں۔ اب شاد، حسرت، صفی، اصغر، فانی، جگر اور یگانہ وغیرہ نے اس میں نئی روح پھونکی۔ انہوں نے غزل کی رنگینی کو باقی رکھتے ہوئے اس میں اعلیٰ خیالات، سچی دلی کیفیتیں اور زندگی کی الجھنوں کے خاکے پیش کئے۔ نتیجتاً نیا انسان ان میں اپنے دل کی دھڑکن سننے لگا۔ غزل کے پیرایہ میں نیا رنگ جھلک اٹھا۔ حسرت کی شاعری میں جو مٹھاس اور رنگینی ہے اس کا مزا ہر اردو پڑھنے والے کی زبان پر رہے گا۔ صفی لکھنوی بھی ایک مشہور شاعر تھے انہوں نے قصیدے، مثنویاں، مرثیے، غزلیں اور نظمیں سبھی کچھ لکھا ہے۔ سیماب اکبرآبادی آگرے کے مشہور شاعر تھے۔ انہیں نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ اصغر گونڈوی صوفیانہ رنگ کے شاعر تھے۔ فانی بدایونی مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غم و الم کے مضامین بڑی دلکشی کے ساتھ نظم کرتے تھے۔

نظم لکھنے کا جو سلسلہ حالی، آزاد، شبلی، اور اکبر کے یہاں چلا تھا اس نے ایک

غیر معمولی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کو جنم دیا۔ انہوں نے فلسفہ اور شاعری رنگینی اور سنجیدگی کو اس طرح یکجا کیا کہ شاعری جادو بن کر رہ گئی اور علم بھی۔ انہوں نے انسانوں کی عظمت آزادی اور قوت کے گیت گائے۔ برج نرائن چکبست بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ انہوں نے ہندستان کی قومی زندگی کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔

مولانا حسن رضا خاں بریلوی نے ۱۸۵۸ء میں جنم لیا اور ۱۹۰۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنی زندگی کے پچاس برسوں میں انہوں نے اردو زبان و ادب کو نئے دور میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ذوق، غالب، مومن اور ظفر نے اردو شاعری کی جس روایت کو چھوڑا تھا وہ حالی، شبلی، آزاد اور اکبر کے ساتھ نئے دور میں داخل ہوئی۔ اور جہاں غزل کے مقابلے میں نظم پر زور تھا لیکن امیر مینائی، داغ دہلوی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی اور یگانہ چنگیزی اپنے کلام کے ذریعے اردو شاعری کو پھر غزل کی طرف لوٹا لائے۔ اور اس کے موضوعات میں زبردست تنوع پیدا ہو گیا۔ اس تنوع میں نظم گو شاعر علامہ اقبال کے کلام کی حیثیت مقدم ہے۔

داغ دہلوی ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کی حیثیت ایک استاد کی تھی۔ سب لوگ ان کے دل کش طرز کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے دہلی سے رامپور اور وہاں سے حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ اپنی شاعرانہ عظمت سے دھوم مچادی۔ رام پور میں اور دہلی و لکھنؤ سے آتے ہوئے سفر کے درمیان معرکے ہوئے۔ داغ کے جدید رنگ کو مقبولیت حاصل ہونے کی بنا پر امیر مینائی اور جلال کو اپنا لکھنوی طرز و رنگ

ترک کر کے داغؔ کے رنگ کو اختیار کرنا پڑا۔ داغ کا رنگ جراتؔ کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ جو رامپور میں بہت مقبول ہوا۔ ہر خاص و عام ان کے رنگ کا دل دادا تھا۔ امیر مینائی جو داغؔ کے حریف تھے انہوں نے بھی داغؔ کے رنگ کو اپنایا چنانچہ ان کا دیوان ''مخانہ عشق''، داغؔ کے رنگ میں ہے۔ یہی حال جلال لکھنوی کا بھی سمجھنا چاہیے۔

رامپور میں جو جدید رنگِ شاعری پیدا ہوا وہ داغ کے رنگ کے اتباع کا نتیجہ تھا۔ داغ کا پہلا دیوان ''گلزارِ داغ'' کا کلام دہلی میں کہا گیا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں رامپور میں ملازمت ملنے کے بعد مستقل سکونت اختیار کر لی اور اپنے کلام پر نظر ثانی کر کے چھپوایا۔ ان کے اشعار پر جدید رنگ کا غلبہ رامپور میں ہی چڑھا۔ داغ کو استادی کا مرتبہ تو دہلی ہی میں حاصل ہو گیا تھا لیکن پختگی اور قادر الکلامی کی دولت رامپور میں عطا ہوئی۔ یہاں امیرؔ مینائی، جلالؔ لکھنوی اور منیرؔ شکوہ آبادی جیسے زبردست شعراء سے بار بار ٹکرا کر وہ مستند استاد بن گئے۔ پروفیسر احتشامؔ حسین نے داغ کی مقبولیت کے سلسلے میں دو باتیں کہی ہیں۔ اول قیامِ رامپور کے دوران داغؔ کی شاعری چمکی اور امتیازی خصوصیات پیدا کر کے منفرد ہو گئی۔ دوم پختگی اور قادر الکلامی کی دولت رامپور نے عطا کی، پروفیسر نور الحسن ہاشمی داغؔ کی جدید رنگ کی انفرادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''معاملہ بندی کے واقعات جس شوخی، چلبلے پن، صفائی اور روانی کے ساتھ داغ نے باندھے ہیں۔ اور کسی کے حصے میں نہ آئے اور یہی داغ کا اپنا انفرادی اور انوکھا رنگ ہے۔
معاملہ بندی کے مضامین جراتؔ نے بھی باندھے ہیں لیکن

ترک کر کے داغؔ کے رنگ کو اختیار کرنا پڑا۔ داغ کا رنگ جراتؔ کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ جو رامپور میں بہت مقبول ہوا۔ ہر خاص و عام ان کے رنگ کا دِل دادا تھا۔ امیر مینائی جو داغؔ کے حریف تھے انہوں نے بھی داغؔ کے رنگ کو اپنایا چنانچہ ان کا دیوان ''صنم خانہ عشق'' داغؔ کے رنگ میں ہے۔ یہی حال جلال لکھنوی کا بھی سمجھنا چاہیے۔

رامپور میں جو جدید رنگِ شاعری پیدا ہوا وہ داغ کے رنگ کے اتباع کا نتیجہ تھا۔ داغ کا پہلا دیوان ''گلزارِ داغ'' کا کلام دہلی مین کہا گیا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں رامپور میں ملازمت ملنے کے بعد مستقل سکونت اختیار کر لی اور اپنے کلام پر نظر ثانی کر کے چھپوایا۔ ان کے اشعار پر جدید رنگ کا غلبہ رامپور میں ہی چڑھا۔ داغ کو استادی کا مرتبہ تو دہلی ہی میں حاصل ہو گیا تھا لیکن پختگی اور قادر الکلامی کی دولت رامپور میں عطا ہوئی۔ یہاں امیرؔ مینائی، جلالؔ لکھنوی اور منیرؔ شکوہ آبادی جیسے زبردست شعراء سے بار بار ٹکرا کر وہ مستند استاد بن گئے۔ پروفیسر احتشامؔ حسین نے داغ کی مقبولیت کے سلسلے میں دو باتیں کہی ہیں۔ اول قیامِ رامپور کے دوران داغؔ کی شاعری چمکی اور امتیازی خصوصیات پیدا کر کے منفرد ہو گئی۔ دوم پختگی اور قادر الکلامی کی دولت رامپور نے عطا کی، پروفیسر نور الحسن ہاشمی، داغؔ کی جدید رنگ کی انفرادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''معاملہ بندی کے واقعات جس شوخی، چلبلے پن، صفائی اور روانی کے ساتھ داغ نے باندھے ہیں۔ اور کسی کے حصے میں نہ آئے اور یہی داغ کا اپنا انفرادی اور انوکھا رنگ ہے۔
معاملہ بندی کے مضامین جراتؔ نے بھی باندھے ہیں لیکن

داغ کی جلی کٹی، طعن وتشنیع، رشک وبدگمانی چھیڑ چھاڑ، لاک ڈانٹ، چھین جھپٹ والے مضامین وہاں کہاں۔''

داغ دہلوی نے اپنے استاد ذوق کے رنگ کو رامپور آنے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ اور نیا رنگ اختیار کیا تھا۔ ایجاد نہیں کیا تھا۔ جو جرأت کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ داغ کے کلام کی مقبولیت رام پور کے عوام میں ہوئی چنانچہ مشہور ہے کہ مشاعرے کے اختتام پر جب سامعین باہر آتے تو ان کی زبان پر داغ کے اشعار ہوتے۔ اس مقبولیت ہی نے امیر مینائی وغیرہ کو اس جدید رنگ کو اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

داغ دہلوی کے شاگردوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر محمد اقبال کا ہے۔ اس غیر معمولی شاعر نے نظم لکھنے کا جو سلسلہ حالی، آزاد، شبلی اور اکبر الہ آبادی نے چلایا تھا، اسے نیا اسلوب وآہنگ دیا اور موضوعات میں زبردست تنوع پیدا کیا۔ اقبال کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ بانگِ درا بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز۔ وہ شاعر کے علاوہ قومی رہنما بھی تھے۔

مولانا حسن بریلوی کے ہم عصروں میں اکبر الہ آبادی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جن کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ ان کی شاعری میں قدیم اور جدید۔ نئے اور پرانے مشرق ومغرب کی کشمکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس سے وقت کی رفتار کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اکبر وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ تھوڑے دن ان کی پیروی کرنے کے بعد ظرافت کی طرف مائل ہو گئے۔ اکبر سرکاری ملازمت میں تھے۔ اس لیے کھل کر انگریزوں کی تنقید نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے طنز ومزاح کے لباس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہنسی ہنسی میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم اور نئے

خیالات نے لوگوں کو اپنے اخلاق و مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ وقت کی رفتار کو نہ روک سکے اور قومی زندگی کی طرح بہت سی کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا سیدھے سادے انداز میں اور ہلکے پھلکے اشعار میں انہوں نے بڑی گہری اور پرمغز باتیں کہیں ہیں۔ جن کا کوئی دوسرا شاعر مشکل سے مقابلہ کرسکتا ہے۔

مولانا حسنؔ رضا بریلوی کے عہد میں زمانے نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے کے بعد حالات یکسر بدل گئے تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ خیالات کی طرح زمانے کے ساتھ ادب بھی بدلتا ہے جو سماج میں شعوری اور غیر شعوری طور پر تبدیلی بھی لاتا ہے۔ یہ تبدیلی اس صورت میں ممکن ہے جب زندگی بسر کرنے کے طریقوں میں بھی تبدیلیاں ہوں۔ ہمارا ملک ہزاروں سالوں سے ایک ہی راستے پر چل رہا تھا۔ بادشاہ ہوتے تھے۔ ان کا دربار ہوتا تھا۔ ان کی حکومت ان کی مرضی کے مطابق چلتی تھی۔ عوام حکومت میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ نہ کوئی بڑی تبدیلی ہوتی تھی، نہ کوئی انقلاب آتا تھا ایک خاندان کے بادشاہ کمزور ہو جاتے تھے تو دوسرے خاندان کے لوگ اس کی جگہ لے لیتے تھے۔ بادشاہ اور جاگیرداری کے زمانے میں ایک حد تک تبدیلی ہوتی تھی؛ پھر زوال شروع ہو جاتا تھا۔ ہندستان میں بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ تبدیلی اور ترقی کے لیے راستے دکھائی دینے لگے تھے۔

ہندستان میں سیاسی زوال کی ابتدا اسی وقت شروع ہو چکی تھی۔ جب سترھویں صدی میں یہاں پرتگالی، انگریز، ڈچ اور فرانسیسی تجارت کے لیے آنے لگے تھے۔ پہلے تو انہوں نے دھیرے دھیرے تجارت کا جال بچھایا پھر عیسائی مذہب پھیلانا شروع کیا۔ وہ اپنی تجارتی کوٹھیوں کے لیے فوج رکھتے اور ہندستانیوں کے معاملات

میں دخل دینے لگے۔ ان کی تجارت بڑھی تو ہندستان کی دولت باہر جانے لگی۔ دستکاری ختم ہونے لگی۔ کسانوں، کاشت کاروں کی زندگی پر گہرا اثر پڑنے لگا۔ منڈیاں بکھرنے لگیں۔ ہندستان کے کچے مال سے یورپ میں بڑے بڑے کارخانے چلنے لگے۔ اور ہمارا ملک ہندستان غریب ہوگیا۔ مغل حکومت کمزور ہوچکی تھی اور اس کے بہت سے حصوں میں آزاد سلطنت قائم ہوگئی۔ جوایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اور فرانسیسی یہاں کے بڑے بڑے نوابوں اور مہاراجوں کے دوست بن کر انہیں لڑاتے تھے۔ پہلے تو فرانسیسیوں کا اثر کافی معلوم ہوتا تھا۔ پھر انگریز ہی میدان میں رہ گئے۔ انہوں نے مدراس، بمبئی، کلکتہ میں اپنی حکومتیں قائم کرلیں اور آہستہ آہستہ بڑی بڑی ریاستوں اور طاقتوں سے ٹکر لینے لگے۔ ان کا اثر اتنا بڑھا کی دلی کی مغل حکومت ان کی دست نگر ہوئی۔ اور اودھ میں ان کی فوجیں رہنے لگیں۔

اسی سیاسی زوال کے بعد ہندستان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ وہ زیادہ غور طلب ہیں۔ عیسائی مذہب کی ترقی ہونے لگی ہندوؤں اور مسلمانوں کے پرانے عقیدوں میں فرق آنے لگا۔ نئی تعلیم پھیلی اور لوگ انگریزی زبان وادب سے واقف ہوئے۔ ریلیں چلیں، تار گھر کھلے باہر کی دنیا سے واقفیت ہوئی۔ ان سب باتوں کا اثر یہاں کے ادب پر پڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے پرانی باتوں میں یا تو اصلاح کی یا باہر کی نئی باتیں سیکھیں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ زندگی میں اس طرح کا لین دین ہوتا ہی رہتا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہی رہتے ہیں۔ جن لوگوں نے دوسرے ملکوں کے ادب سے واقفیت حاصل کی تھی وہ اپنے ادب میں بھی نئی باتیں

دیکھنا چاہتے تھے یہ ساری تبدیلیاں بڑے پیمانے پر ہو رہی تھیں۔ دربار ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے شاعر جاگیرداروں اور امیروں کی خوشی کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی کہتے تھے۔ اخبار نکل رہے تھے اس لیے نثر کی ترقی ہو رہی تھی۔ پریس قائم ہو چکے تھے اس لیے کتابوں کے چھپنے اور لوگوں تک پہنچنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ ہندستان کی تقریباً ہر زبان ان باتوں سے متاثر ہو رہی تھی صرف اردو کی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر مذہب اور طبقہ پر اثر پڑ رہا تھا۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے کی مذہبی تحریک مسلمانوں میں سرسید کی اصلاح اس کی مثالیں ہیں۔ اسی زمانے میں ۱۸۸۷ء میں وہ مشہور انقلاب ہوا جس کو ہم میں سے کچھ لوگ اسے غدر کے نام سے جانتے ہیں۔ اس ہنگامہ میں آخری دفعہ ہندستانیوں نے انگریزوں کے خلاف فوجی بغاوت کی اور اگرچہ ہار گئے لیکن آزادی کا چراغ اس طرح جلا گئے کہ وہ کبھی نہ بجھا۔ اس زمانے میں جو تاریخ لکھی گئی اُسے جدید تاریخ اور ادب کو جدید ادب کہتے ہیں۔ جدید اردو ادب کا خیال آتے ہی مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، سرسید، مولوی نذیر احمد، علامہ شبلی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام روشن حرفوں میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور ہوا کے رخ کو پہچانا اور اردو ادب کی باگ ڈور ادھر موڑ دی۔ اس کا یہ مطلب نہیں پرانے رنگ کا ادب ختم ہو گیا۔ سیکڑوں ادیب و شاعر اب بھی چھوٹے چھوٹے درباروں سے وابستہ تھے اور پرانی روایتوں کی نقل کر رہے تھے۔ ان میں امیر لکھنوی، امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ قدیم رنگ کے بہت بڑے شاعر تھے انہوں نے اردو ادب کی جو خدمات سرانجام

دیں وہ سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔

درحقیقت انیسویں صدی کے آخری حصے سے ہی اردو ادب کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ شاعری کا رنگ بدلنے کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی نئے اصناف ادب کا داخلہ ہوا۔ ناول، نئے انداز کی سوانح نگاری، تنقید، مضمون نگاری، تاریخ وغیرہ کی ابتدا اسی زمانے سے ہو جاتی ہے۔ سرسید، حالی، آزاد، ذکاء اللہ، نذیر احمد، شبلی، اکبر، سرشار اور شرر کے ہاتھوں اردو ادب کی دنیا بدلتی نظر آتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا کارنامہ بے حد وقیع، اہم اور اردو کے خزانے کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس دور میں سرسید کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے اسے سرسید کا عہد بھی کہتے ہیں۔ وہ ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکر رہے۔ وہ مذہبی اور علمی کام بھی کرتے تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو وہ جاگ اٹھے اور انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور تعلیم کی طرف توجہ دی۔ کتابیں لکھیں۔ اسکول قائم کئے۔ ہندستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے حقوق کی حمایت کی انہوں نے مذہبی مسائل پر بہت کچھ لکھا۔ لیکن ان کے علمی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوتے تھے۔ جسے خود انہوں نے جاری کیا تھا۔ ان کے مضامین نے ادب میں بھی انقلاب پیدا کیا اور خیال میں بھی وہ صاف ستھری پر اثر انداز میں نثر لکھتے تھے۔ خیالی باتیں کرنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔

مولانا حسن رضا بریلوی کے ہم عصروں میں سرسید احمد خاں کے علاوہ، حالی، آزاد، نذیر، شبلی، اکبر، شرر، سرشار، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ مولانا کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا ہے۔ تقریباً یہی زمانہ حالی (۱۹۱۴ء) آزاد (۱۹۱۰ء) نذیر

احمد (۱۹۱۴ء) شبلی (۱۹۱٦ء) اکبر (۱۹۲٦ء) شرر (۱۹۴٦ء) اور سرشار (۱۹۰۰ء) کا ہے۔ الطاف حسین حالی کو نئے دور کا بانی کہا جا سکتا ہے وہ غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، شیفتہ سے بہت متاثر تھے۔ انکا قول تھا کہ ہمیں زمانے کے مطابق قدم اٹھانا چاہئے زمانے کو سامنے رکھ کر انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور نثر میں کتابیں بھی۔ وہ باتوں کو سادگی اور سچائی سے پیش کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے انہیں نئے ڈھنگ کی نظمیں لکھنے کے لیے اکسایا۔ ان کا اردو ادب کے شعراء اور نثری سرمایہ میں سب سے اہم نام ہے محمد حسین آزاد دہلی کے رہنے والے تھے۔ ذوق کے شاگرد تھے غدر کے بعد لکھنؤ اور پنجاب میں ملازمت کی اور لاہور میں رہ کر اعلا پائے کے ادبی کام کئے۔ ان کی نثر بہت دلکش اور رنگین ہوتی ہے۔ جدید ادب کے معیاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آبِ حیات، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، نیرنگِ خیال، ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد کا بہت بلند مقام ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انگریز حکومت نے شمش العلماء کا خطاب عطا کیا۔ قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ مذہبی مشاغل پر کتابیں لکھیں۔ قانونی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ بچوں اور بچیوں کے لیے درسی کتابیں لکھیں اخلاقی و اصلاحی ناولیں لکھیں۔ وہ دلی کی محاوراتی زبان اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ نذیر احمد ایک شاعر بھی تھے لیکن بہ حیثیت شاعر زیادہ مشہور نہ ہو سکے۔ تیسرا بڑا نام اس عہد میں شبلی کا ہے جو اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ عربی و فارسی سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا لیکن طبیعت علمی و ادبی کاموں کی طرف مائل تھی۔ ندوہ، دارالمصنفین اور شبلی کالج

ان کی یادگاریں ہیں۔ اردو ادب میں ایک شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے بھی لوگ انہیں جانتے ہیں۔ انہوں نے مختلف کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سوانح تنقید پر مشتمل کتابیں ہیں۔ ان کے خطوط کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس دور کا ایک بڑا نام اکبرالہ آبادی کا ہے جو بڑے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں جدید و قدیم کی کشمکش نظر آتی ہے۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر اسی دور کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے بڑے دلچسپ ناول لکھے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شمار اردو کے بہترین مصنفوں میں ہوتا ہے۔

اسطرح نیا دور شروع ہوتے ہی اردو کو اعلیٰ پائے کے ادیب مل گئے۔ جنہوں نے دلی لگن کے ساتھ ادب کے ہر شعبے کو چمکانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے مغرب سے آتے ہوئے نئے علوم و فنون، خیالات اور معلومات سے اسطرح مدد لی کہ ہندستانی ادب کا مزاج نہیں بدلا۔ ان کا دامن البتہ وسیع ہوگیا۔ نئی شاعری اور اس میں نئے انداز کے علاوہ ڈراما، تنقید، سوانح نگاری، انشائیہ، علمی مضمون نگاری ہر چیز کو فائدہ پہنچایا اور نئی نسلوں کو اندازہ ہوا کہ ادب کے ذریعہ سے قومی زندگی میں جوش اور گہرائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ متذکرہ بالا سطور میں جن ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر ادب میں مقصد کے قائل تھے اور ادب کی خوبصورتی کو بھی نقصان نہیں پہنچنے دیتے تھے۔

مولانا حسن رضا بریلوی کو سمجھنے کے لیے ان کے عہد معاصرین اور ادبی فضا کو سمجھنا ضروری ہے متذکرہ بالا صفحات میں انہیں باتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں، حالی، نذیر احمد، شبلی اور محمد حسین آزاد اور اکبرالہ آبادی اپنے عہد کے عہد

ساز تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے قوم اور زبان و ادب کی خدمت کی اور وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ حسن رضا بریلوی اپنے ماحول سے اور ادبی فضا سے شاعری کی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے عشقیہ شاعری کی اور زبان و بیان میں داغ دہلوی کا طرز اختیار کیا۔ باقی وہ مذہبی دنیا کے آدمی تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ پوری طرح مذہبی آدمی بن کر رہ گئے تھے یہاں تک کے ''ثمر فصاحت'' کی عشقیہ شاعری کے علاوہ ان کی تمام تر شاعری کا محور نعتیں لکھنا تھا۔ نثر میں بھی وہ پوری طرح مذہب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جن رسائل سے جڑے رہے ان میں بھی مذہبی تحریریں حاوی رہیں۔ سرسیدؔ کی طرح انہیں قوم و ملت کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر احمد کی طرح اپنی تحریروں سے انہوں نے اخلاقیات کے درس نہیں دیئے۔ تعلیمی نظام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ شبلی کی طرح ان کی تنقیدی نظر نہیں تھی۔ ادب میں سوائے عشقیہ شاعری کے کوئی اضافہ نہیں ملتا۔ انہیں تاریخی شعور بھی تھا تو اس کا محور بھی مذہب خصوصاً امام حسین یا رسولؐ کی زندگی ہی تھی۔ حالیؔ کی طرح معیاری شاعری پر حسنؔ رضا بریلوی کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ حالیؔ کی طرح وہ اپنا قوم کا درد نہیں رکھتے۔ اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے ہی ان کے پاس کوئی اسکیم تھی۔ محمد حسین آزادؔ کو ان کی علمی اور ادبی خدمات کے عوض شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔ مولانا حسنؔ رضا کی کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جو آزادؔ کے مقابلے میں رکھی جا سکے۔

مولانا حسنؔ رضا نے اپنے عہد سے جو تاثر قبول کیا وہ قدیم و جدید شاعری تھی جس کی شکلیں ''ثمرِ فصاحت'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے وہ اپنے

شعری اسلوب میں داغ کے بہت قریب تھے۔ داغ کا رنگ ان کی نعتیہ شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ نثر نگاری میں ان کا لہجہ عام فہم، روز مرّہ کے قریب اور رواں دواں ہے جو یقیناً اردو نثر کے ارتقاء میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ امیر مینائی وجلال لکھنوی کی شاعری کا لب ولہجہ مولانا کے لیے مشعلِ راہ بنا۔

باب سوم

حسنؔ بریلوی کی ادبی خدمات

حسنؔ رضا بریلوی نے نظم ونثر دونوں میں لکھا ہے۔ اردو ادب میں وہ بحیثیت غزل گو شاعر، نعت گو شاعر، ایک صحافی اور نثر نگار کے جانے جاتے ہیں۔ مولانا جب رامپور سے بریلی واپس تشریف لائے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ان کے لیے بزمِ سخن ہمیشہ آراستہ رہتی تھی۔ مولانا اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اقلیم شاعری کی باگ ڈور تھامے رہے آپ کے زمانے میں نعتیہ شاعروں کا رواج بھی عام ہوا۔ غزل گوئی بھی شاعروں میں متعارف ہونے لگی۔ مولانا کا دور ایک دلچسپ، رنگا رنگ اور ہماہمی کا دور تھا۔ داغؔ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے انہوں نے فصاحت کو ہی غزل گوئی سمجھ کر سخن سنجی کی اور اپنے استاد کی تقلید کی۔ ان کے الفاظ تراکیب لغات، روز مرّہ، محاورے جانِ فصاحت ہیں۔ زبان میں غضب کی کشادگی اور خوش گوئی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے علم وفضل، اپنے اتقا، خودداری اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہیں

جانے دیا۔ زود گوئی کے باوجود غزل گوئی کی فضا کو برقرار رکھا۔ انہوں نے دل کی کسک اور قلب کے نور کو اعلیٰ شاعری میں پیش کیا۔ مولانا حسن رضا فطری طور پر غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

مولانا نے نعتیہ شاعری کو فروغ دیا۔ یہاں تک کہ لوگوں کو نعتیہ مشاعروں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مولانا کی تعلیم و تربیت، مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے باعمل زندگی گزارنے والے کی شعر گوئی کی فطری صلاحیت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ نعت لکھے۔ چنانچہ انہوں نے نعت گوئی میں امتیاز حاصل کیا۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ ''ذوقِ نعت'' ۱۹۰۷ء تک دس مرتبہ شائع ہو چکا تھا۔ نعت گوئی میں انہوں نے داغ دہلوی کے بجائے اپنے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب سے اصلاح لی۔ ان کی نعت گوئی میں غزل کی مخصوص زبان اور پیرایۂ بیان ملتا ہے۔ ان کی نعتوں میں ان کے جذبات غزل کی زبان اور غزل کی اشاریت کے سہارے اس قدر زود اثر ہو گئے ہیں کہ وہ اردو کی نعتیہ شاعری میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے۔ ''ذوقِ نعت'' میں تین مثنویاں بھی شامل ہیں۔ مثنویوں کا انداز غزل سے اور خاص طور سے داغ اسکول کی غزل سے مختلف ہے۔ اشعار پُر مغز کیف آور وجد آفریں کہے جا سکتے ہیں۔ مولانا حسن رضا نے آخر میں بہاریہ رنگ ترک کر دیا تھا اور مجازی شاعری سے اجتناب کر لیا تھا اس لیے آپ نے اپنے غزل کے مجموعہ ثمرِ فصاحت کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا۔ انتقال کے بعد آپ کے شاگرد سید برکت علی نامی بریلوی نے اس مجموعہ کو شائع کیا۔

مولانا حسن رضا بریلوی کی نثری تصانیف زیادہ تر مذہبی ہیں۔ انہوں نے

اپنے دور کی مذہبی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نثر کا استعمال کیا۔ انگریزوں کی پھیلائی ہوئی گمراہی اور اپنی اور زمانۂ حال کے سیاست دانوں کی گمراہی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے نثر میں خوب لکھا۔ انہوں نے اہل سیاست کے مکر وفریب کو آشکار کرنے کے لیے بے موقع فریاد کے جواب میں در مسئلہ قربانی تصنیف کی۔ مولانا جدید نثر کے بانیوں میں سے تھے۔ عربی و فارسی کے لب و لہجے سے ہٹ کر صاف۔ اور ستھری زبان انہوں نے اپنی نثری تحریروں میں استعمال کی ہے۔ ان کی نثر میں رنگینی شاعرانہ حد تک ہے۔ جس نے بیان کو زور دار، با اثر اور معیاری بنا دیا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے روز مرہ کی بول چال میں آسان مگر پر کیف انداز میں مدلل طریقے سے لکھتے ہیں اور اپنے مقصد کو پر اثر انداز میں واضح کرتے ہیں۔ غیر ضروری الفاظ کا ان کے یہاں استعمال نہیں ہے۔ نثری صرف ونحو کے عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ مولانا کی نثر پُر جوش اور زور دار ہے۔ ان کے مضامین انتہائی فکر انگیز، جاندار بصیرت افروز اور پر اثر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں سلاست ہے، بے تکلف انداز ہے۔ وہ قادر الکلام نثر نگار اور صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ ان کی نثر کی ایک خوبی موضوع کے اعتبار سے اسلوب کا بدلنا ہے۔ مولانا کی نثر کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے۔

''سیاہ پردے کی چلمن سے کسی محبوب دل نواز کی پیاری
پیاری تجلیاں چھن چھن کر نکل رہی ہیں جن کی ہوش
ربا تاثیروں دلکش کیفیتوں کی یہ مجلس آرائیاں ہیں۔''

(نثر مرجز کی مثال)

''وطن قدموں پر لوٹتی ہے کہ کہاں جاتے ہو غربت
دامن کھینچتی ہے کیوں دیر لگاتے ہو۔''

(نثرِ مقفیٰ)

''......مگر اس ہونے والے واقعے کو کون روک سکتا تھا
جسے قدرت نے مدتوں پہلے سے مشہور کر رکھا تھا....کہ روزِ
قیامت ہم ان کی شفاعت فرما کر کام آئیں نہ یہ کہ ان کے
ساتھ غضب اور انتقام کو کام میں لائیں۔''

(نثرِ مسجع)

''میدانِ کربلا میں حق و باطل کا معرکہ شباب پر ہے۔
حضرت عبداللہ سید بن عمر کلبی زیاد کا غلام بسیار اور ابن زیاد
کا غلام سالم کے مقابلے کے لیے تشریف لائے وہ ظالم
بولے ہم تم کو نہیں جانتے نہ زہیر بن قیس یا حبیب بن مطہر یا
یزید بن حضر ہمارے مقابلے پر آئیں۔''

(نثرِ عاری)

'واقعاتِ شہادت'' پر نظر جاتی ہے تو حیرت کی آنکھوں سے
آنسو نہیں لہو کی بوندیں ٹپکتی ہیں اور خدا کی بے نیازی کا عالم
آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔''

(نثرِ سلیس رنگین)

''ابن جوزہ نے حضور کی طرف گھوڑا چمکایا قدرت خدا کی

گھوڑا بھڑکا اور یہ پھسلا ایک پاؤں رکاب پر الجھ کر رہ گیا اور اب گھوڑا اڑا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس مردود کی ران اور پنڈلی ٹوٹی سر پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا آخر اسی حال میں واصلِ جہنم ہوا۔

(محاسبات)

تشنہ کاموں پر تیروں کا مینہ برسانا شروع کر دیا
شمر مردود حملہ کر کے خیمہ اطہر کے قریب پہنچا اور جنت والوں کا خیمہ پھونکنے کو جہنمی نے آگ مانگی۔

''کلیجے کے ٹکڑے ٹکڑے خون میں نہائے آنکھوں کے سامنے پڑے ہیں ہری بھری پھلواری کے سہانے اور نازک پھول پتی پتی ہو کر خاک میں ملے ہیں۔ اور کچھ پرواہ نہیں ہوئی تو کیوں ہوتی کہ راہ دوست میں گھر لٹانے والے اسی دن کے لیے مدینہ سے چلے تھے۔''

''شعبان کی چوتھی رات کے تین پہر گزر چکے ہیں اور پچھلے پہر کے نرم نرم جھونکے سونے والے کو تھک تھک کر سلا رہے ہیں۔ ستاروں کے سنہرے رنگ میں کچھ کچھ سپیدی ظاہر ہو چکی ہے۔ اندھیری رات کی تاریکی اپنا دامن سمیٹنا چاہتی ہے۔''

''مولانا حسن رضا بریلوی کی تصنیف دینِ حسن ۴۸ صفحات

پر مشتمل ایک رسالہ ہے جو رسولؐ کی بارگاہ میں غیر مسلم مصنفین کے اعترافاتِ حقیقت کی ایک پیش قیمت تلخیص ہے۔اس رسالے میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے اعترافات کو یکجا کیا گیا ہے۔جو ایک طرف مومنین کے لیے باعثِ تقویت ایمان ہے تو وہیں دوسری طرف مخالفینِ اسلام کے لیے ایک زبردست حجت ثابت ہے۔''

ماہنامہ ''قہر الادیان'' کے مولانا خود ہی مدیر تھے۔یہ رسالہ ایسے وقت میں شائع ہوا جب قادیانیت اور مرزائیت اپنے بالوں کو پھیلا رہی تھی۔اس رسالے کے اداریوں کے ذریعے آپ نے جرأت مندانہ اقدام کر کے ان مسلکوں کی بیخ کنی کی اور اسلام کی اصل روح کو سمجھانے کی سعی کی۔

"ندوہ کی روداد سوم"میں مولانا کی نقد ونظر کا پتہ چلتا ہے ایک معتبر اور علم دوست شخصیت کیا سوچتی ہے ان کے خیالات وافکار، باریک بینی نازک خیالی، نکتہ رس اور نکتہ داں شخصیت کا پتہ دیتے ہیں۔عبارت کے ہر جملہ میں تعمیری تنقید کی جھلک نظر آتی ہے۔یہ تنقید ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی۔آپ نے ندوہ کی مختصر روداد سوم پر بڑے موثر انداز میں تنقید کی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''یہی وہ تعلیم ہے جس کی اشاعت ندوہ چاہتی ہے (مختصر روداد سوم) کچھ حیا بھی ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ کی یہی تعلیم تھی کہ رافضیوں کی تعلیم کرو، وہابیوں کے غلام ہو، نیچریو کی لوسہ لیپی کرو۔۔انہیں سب کو دینی پیشوا بنا کر مسندوں پر

جلوہ دو۔ ان کی لغویات و ضلالات پر سکوت محض کرو بلکہ
تحسین کر کے خود چھاپو (اس اقتباس سے مولانا کے مسلک کا
بھی پتہ چلتا ہے۔''

اسی قبیل کی ایک اور کتاب ''ندوہ کا نتیجہ'' بھی ہے اس میں صاف، طور پر یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ ندوہ کا اصل مقصد کیا ہے اور اس کا دارالندوہ سے کتنا علاقہ ہے۔ یہ بھی ندوہ پر تنقید سے عبارت ہے۔

ندوہ سے متعلق ایک تالیف ''سوالات حق بروس ندوۃ العلما'' ہے جو انکشاف حق اور انکشاف باطل کے اصول پر مرتب کی گئی ہے، اس میں ندوہ سے ستر سوالات کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ''سوالات حق نما'' میں مسئلہ حب بعض پر ضروری کلام کی سرخی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

''آئینہ قیامت'' ایک محققانہ تصنیف ہے جس میں واقعاتِ کربلا کی حقیقت کو آشکارا کیا گیا ہے۔ ایامِ محرم میں مرثیوں کے ساتھ اس کتاب کے اقتباسات بھی پڑھے جاتے تھے۔ یہ کتاب ایک شہادت نامہ ہے۔ جو مستند روایات پر مبنی ہے۔ غلو و اغراق سے پاک ہے۔ زبان و بیان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتے ہوئے بھی ادب کی بھرپور چاشنی کی حامل ہے۔

''نگارستان لطافت'' یہ تذکرہ میلاد شریف میں نہایت ہی ایمان افروز رسالہ ہے۔ جو پرانے طرز کے میلاد شریف کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک حمد یہ نظم کے بعد حمدیہ نثر میں رسول صلعم کے ذکر میلاد کے ساتھ متعدد نعتیں جگہ جگہ درج ہیں۔

حسب بالا تحریروں میں خالص مذہبی معاملات درج ہیں اردو نثر کے ارتقائی عمل میں ان کی حیثیت ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ خالص ادبی تحریریں نہیں ہیں مولانا کی ایسی تصانیف جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے ان میں بھی ایک مذہبی اور دوسری بہار یہ شاعری پر مشتمل ہیں۔ مذہبی شاعری میں اس کا نام ''ذوقِ نعت'' ہے جس میں شاعری کے جوہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ذوقِ نعت ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی جسے ہم نعتیہ شاعری کا دیوان بھی کہہ سکتے ہیں یہ دیوان فنی مہارت، قادرالکلامی، اور فکر کی پختگی کا اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ''ذوقِ نعت'' میں نعتوں سے پہلے دو حمدیں ہیں جس میں مولانا کا انفرادی اسلوب صاف دیکھنے کو ملتا ہے۔ نعتیہ شاعری کا مرکزی خیال رسولؐ صلعم کی ذاتِ گرامی ہوتی ہے۔ اس لیے پوری نعتیہ شاری اسی دائرے میں تجلیاں بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذکر سراپائے حضور ﷺ، چہرہ، رخسار، عارض، سراپا، دندان، گردن، ابرو، دہن، لب، گیسو وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

گلزار کو آئینہ کیا منہ کی چمک نے
آئینہ کو رخسار نے گلزار بنایا

روئے مولا سے اگر اٹھتا نقاب
چرخ کھا کے غش میں گرتا آفتاب

سر سے پا تک ہر ادا ہے لاجواب
خوب رویوں میں نہیں تیرا جواب

مذکورہ بالا اشعار میں تشبیہات دلچسپ ہیں اور غزل کا آہنگ نظر آتا ہے۔

شاید اس کی وجہ ان کے مزاج میں تغزل کا پایا جانا ہے۔ یہ اسلوب ان کی بہاریہ شاعری میں بھرا پڑا ہے۔

ذوقِ نعت'' میں ذکر ولادت حضور پر تین نعتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شعر دیکھیے ۔

تعظیم کو اُٹھتے ہیں ملک تم بھی کھڑے ہو
پیدا ہوئے سلطانِ عرب شاہِ عجم آج

حسن و جمال حضور سے متعلق ایک شعر دیکھیے ۔

نذرانے میں سر دینے کو حاضر ہے زمانہ
اس بزم میں کس شاہ کے آتے ہیں قدم آج
جو ایک گوشہ چمک جائے تمہارے ذرہ در کا
ابھی منہ دیکھتا رہ جائے آئینہ سکندر کا

رفعت مدارج ومقام حضور سے متعلق متعدد اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک شعر دیکھیے ۔

اونچے اونچوں کو تیرے سامنے ساجد پایا
کس طرح سمجھے کوئی رتبۂ اعلیٰ تیرا

اختیارات حضور سے متعلق چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

اللہ اللہ یہ کونین جلالت تیری
فرش کیا عرش پہ جاری ہے حکومت تیری
یہ نہیں ہے کہ فقط اک ہے مدینہ تیرا
تو ہے مختار اور عالم پہ ہے قبضہ تیرا

سماعتِ حضور سے متعلق ایک شعر ہے ۔

آتا ہے فقیروں پہ ابھی پیار کچھ ایسا
خود بھیک دیں اور خود کہیں منگتا کا بھلا ہو

حشر و محشر کا ذکر دوسرے شاعروں کی طرح مولانا کے نعتیہ کلام میں بھی ملتا ہے۔ مگر یہاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں نہ خوف و اضطراب ہے اور نہ اپنی پریشانی اور بدحالی کا ذکر۔ آہ و بکا کی صدائیں ہیں اور نہ یاس و نااُمّیدی کا انداز بلکہ یہاں اپنے آقا کی شفاعت پر یقینِ کامل ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ۔

مجمعِ حشر میں گھبرائی ہوئی پھرتی ہے
ڈھونڈنے نکلی ہے مجرم کو شفاعت تیری

مولانا نے نعتوں میں اپنے دل کی تمناؤں کا ذکر کیا ہے۔ اظہارِ عجز بھی ہے۔ مکہ مدینہ سے محبت کا اظہار بھی ہے۔ ان کی نعتوں نے نہ صرف معاشرے کی اصلاح کی بلکہ اسلام کے عقائد کو برقرار رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ شہرِ بریلی کیا ہندستان کے شہروں شہروں میں مولانا کی نعتوں کا چرچہ تھا اور بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ وہ پڑھی جاتی تھیں ۔ کشف و رازِ نجدیت کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں وہابیوں سے خطاب کر کے انہیں بے نقاب کیا ہے اور صحیح عقیدہ سنی مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ بدعقیدوں کی صحبت سے اجتناب کریں۔ اسی ذوق میں نعت میں معراج نبی کی عقیدت کے طور پر نظم کے چند بند درج ہیں۔ نظم مرصع ہے جس میں شوکت الفاظ اور معنویت کے ساتھ زورِ بیان حقیقی پیرایہ میں واضح نظر آتا ہے۔ اس دیوان میں ذکرِ شہادت کے تحت چند نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں فصاحت و بلاغت کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زود گوئی اور درست بیانی ان نظموں کا

عنصر خاص ہے۔ جس کی وجہ سے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے اشعار کا مزہ آجاتا ہے۔ ''ذوقِ نعت'' کے آخری دو صفحات اور بارہ رباعیاں میں صفحہ ۴۳۔۱۴۱ میں ایک نظم ہے۔ جس میں رسول ؐ کا سراپا اول تا آخر ذکر کر کے اسے وسیلہ بنا کر مدد طلب کی ہے۔ اسی نظم کو زلف سے شروع کر کے قدم پر ختم کیا ہے۔ اس کے بعد لباس، عمامہ، عبا، قبا، نعل پاک، سرمہ، مسواک اور آئینہ وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ ذوقِ نعت میں منقبتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

مولانا کی نثری تحریریں اور شاعری اردو ادب میں ایک منفرد آواز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حیرت ہے کہ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو (طبع اوّل ۱۹۳۹) میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مولانا کے شعری مجموعہ ''ذوقِ نعت'' اور ''ثمرِ فصاحت'' بالترتیب ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۸ء میں منظرِ عام پر آچکی تھی۔ مولانا داغؔ دہلوی کے چہیتے شاگرد بھی تھے۔ شاید جان بوجھ کر ان کے نام کو نظر انداز کیا گیا ہو یا نظر چوک گئی ہو لیکن اس سے ان کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا تھا۔ لالہ سری رام کا تذکرہ ''خمخانۂ جاوید'' جلد دوم اور ''چند شعرائے بریلی'' میں مولانا کا ذکر ہے لیکن وہاں بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید ان کی مذہبی زندگی ہو سکتی ہے مگر یہ کوئی جواز نہیں ہے۔

نعت گوئی اور منقبت گوئی میں مولانا اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک صحیح العقیدہ عالم تھے اور اپنے حسنِ عقیدہ اور مذہب میں راسخ تھے۔ اس لیے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار صاحبِ اکرام اور اولیاءعظام کی ذواتِ قدسیہ کے ساتھ پیش کرنے کو وسیلۂ نجات اور عقیدت آخرت سمجھا۔ ذوقِ نعت میں ذکرِ شہادت اور اہل بیت کے

علاوہ گیارہ عدد مناقب بھی موجود ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کے لیے الگ الگ مناقب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ حضور سیدنا غوثِ اعظم کی منقبت میں چار نظمیں موجود ہیں۔ ان میں سے تین نظموں کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ ایک منقبت میں اردو، فارسی، اور دیسی ہندی میں اشعار درج ہیں ہندی کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اَدھر میں پیا موری ڈوبت ہے نیّا
کہوں کا سے اپنی بپا غوثِ اعظم
بپت میں کٹی موری سگری عمریا
کرو موپہ اپنی دیا غوثِ اعظم

منقبتی کلام میں خواجہ غریب نوازؔ، شاہ بدیع الدین اور اچھے میاں (مارہرہ) کے نامِ گرامی لیے جاسکتے ہیں۔

اردو شاعری میں نعت گوئی کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ شاید اس کی وجہ نعت کی مذہبی فضا ہے۔ جب کہ اردو شاعری عموماً مذہب سے انحراف کرتی ہے مولانا حسؔن رضا بریلوی نے نعت گوئی کی طرف توجہ دے کر اس صنفِ شاعری کو قبولِ عام کی سند دی۔ مولانا کے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت اور ذوقِ نعت کے ذریعہ خود مولانا نے نعت گوئی کو اردو ادب میں مستقل ایک ادبی صنف کی حیثیت میں متعارف کرایا۔ اور دوسرے شعرا کو پورے اخلاص ومحبت اور ذوق وشوق کے ساتھ اس طرح راغب کیا۔ ''ذوقِ نعت'' میں صداقت اور حقیقت بیانی کا عکس نظر آتا ہے۔ تصنع، تکلف، جھوٹ یا غیر حقیقت بیانی کی کہیں ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اس مقصدیت کے باوصف سلاست، وفصاحت آمد وبرجستگی، شیرینی وحلاوت، سوز وگداز، شوکتِ

علاوہ گیارہ عدد مناقب بھی موجود ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کے لیے الگ الگ مناقب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ حضور سیدنا غوثِ اعظم کی منقبت میں چار نظمیں موجود ہیں۔ ان میں سے تین نظموں کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ ایک منقبت میں اردو، فارسی، اور دیسی ہندی میں اشعار درج ہیں ہندی کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اُدھر میں پیا موری ڈوبت ہے نیّا
کہوں کاسے اپنی پیا غوثِ اعظم
بپت میں کٹی موری سگری عمریا
کرو موپہ اپنی دیا غوثِ اعظم

منقبتی کلام میں خواجہ غریب نواز، شاہ بدیع الدین اور اچھے میاں (مارہرہ) کے نام گرامی لیے جاسکتے ہیں۔

اردو شاعری میں نعت گوئی کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ شاید اس کی وجہ نعت کی مذہبی فضا ہے۔ جب کہ اردو شاعری عموماً مذہب سے انحراف کرتی ہے مولانا حسن رضا بریلوی نے نعت گوئی کی طرف توجہ دے کر اس صنفِ شاعری کو قبولِ عام کی سند دی۔ مولانا کے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت اور ذوقِ نعت کے ذریعہ خود مولانا نے نعت گوئی کو اردو ادب میں مستقل ایک ادبی صنف کی حیثیت میں متعارف کرایا۔ اور دوسرے شعرا کو پورے اخلاص ومحبت اور ذوق وشوق کے ساتھ اس طرح راغب کیا۔ ''ذوقِ نعت'' میں صداقت اور حقیقت بیانی کا عکس نظر آتا ہے۔ تصنع، تکلف، جھوٹ یا غیر حقیقت بیانی کی کہیں ایک جھلک بھی دیکھائی نہیں دیتی۔ اس مقصدیت کے باوصف سلاست، وفصاحت آمد و برجستگی، شیرینی وحلاوت، سوز وگداز، شوکتِ

الفاظ، ندرتِ تراکیب، تلمیحات و تمثیلات اور صنائع لفظی او ر معنوی خصوصیات مولانا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ انہیں خصوصیات نے ذوقِ نعت کو ایک ادبی حیثیت عطا کی ہے۔فکر وفن کی مثالیں حسبِ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجئے۔

دل کے آئینہ میں جو تصویر جاناں لے چلا
محفل جنت کی آرائش کا ساماں لے چلا

تسلیم میں سر، وجد میں دل، منتظر آنکھیں
کس پھول کے مشتاق ہیں مرغانِ حرم آج

ان کے گدا کے در پہ ہے یوں بادشاہ کی عرض
جیسے ہو بادشاہ کے در پر گدا کی عرض

ذیل میں ایک شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں فکر ونظر کی چاشنی دیکھنے کو ملتی ہے اور مفہوم ومقصد کے اعتبار سے بڑا ہی اچھوتا اور معنی خیز بھی ہے۔

خدا کرتا ہوتا جو تحت مشیت
خدا ہو کر آتا یہ بندہ خدا کا

مولانا کی نعتیہ شاعری فکر کی توانائی، فن کی پختگی اور تخیل کی پاکیزگی کی غماز ہے۔ جدید استعارات، بلیغ تشبیہات زبان کی سادگی و پرکاری اسلوبِ بیان کی رعنائی، الفاظ کی موزونیت اور مضامین کی جامعیت آپ کے کمالِ فن کا مظہر ہیں۔ رسولؐ کے عشق ومحبت میں سرشاری کو کس خوبصورتی سے ذیل کے شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

نمازیں سب ادا ہو جائیں گی اس ایک سجدہ میں
نیازِ عشق سر اٹھنے نہ پائے پائے جاناں سے

نعت گوئی کی راہ کانٹوں کا فرش ہے ذرا سی لغزش شرعی مسائل پیدا کر سکتی ہے مولانا خود ایک شرعی آدمی تھے اس لیے ان کی نعتیہ شاعری شرعی گرفت سے محفوظ اور ہر طرح کے سقم سے پاک ہے۔ عشق رسول کا بانکپن ذیل کے شعر میں ملاحظہ کیجئے۔

خار صحرائے بنی پاؤں سے کیا کام تجھے
آمیری جان میرے دل میں ہے رستہ تیرا

اس شعر میں تغزل کے علاوہ اسلوب بیان کی دلکشی، زبان کی سادگی، عقیدت کی سرشاری، محبت کی لالہ کاری اور عشق کی نغمگی کی ایک دنیا آباد ہے۔

عروض وقوانی کی روشنی میں اگر مولانا کی شاعری کو دیکھا جائے تو صنعتِ تلمیع، صنعتِ تضاد، صنعتِ تلمیح اور صنعتِ اقتباس کی مثالیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔

الٰہی تشنہ کام ہجر دیکھیں دشتِ محشر میں
برسا ابر رحمت کا جھلکتا حوض کوثر کا

(صنعتِ تلمیح)

سبقت رحمتی علی غضبی
تو نے جب سے سنا دیا یارب

(صنعتِ تلمیح)

اترنے لگے مارمیت ید اللہ
چڑھی ایسی زوروں پہ طاقت کسی کی

(صنعتِ اقتباس)

داغ دہلوی کی شاعری بھی ہمیں اسی تناظر میں سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن مجازی کے جلوے ہیں۔ انہوں نے غزل کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ جس انداز سے صوفی شعراء دیکھتے تھے۔ داغ جیتے جاگتے انسان اور گوشت پوست والے معشوق کی قربت کے قائل تھے۔ ان کا معشوق اسی دنیا کا فرد تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں وہ سارے لوازمات موجود ہیں جو عشق مجازی کی طرف ہی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ بات صرف داغ کے یہاں ہی نہیں بلکہ کم وبیش ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اگر ہم ساری اردو شاعری کا جائزہ کریں تو ہمیں ہر شاعر کے یہاں وافر تعداد میں ایسے اشعار ملیں گے جن میں حسن پرستی، بوالہوسی، اذیت کوشی، کچھ پالینے کی خاطر دھول دھپا دھینگا مشتی، بوس وکنار، وصال وقربت وغیرہ سب کچھ مل جائے گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شاعر کسی نہ کسی صورت میں بوالہوس ہے، اذیت کوش ہے اوچھے پن اور شعلے مزاج کا مالک ہے یہیں پر ہمیں حالی کی وہ بات یاد آتی ہے کہ شاعری کے لیے عشق ومحبت کا ہونا ضروری ہے۔ کسی کے عشق میں گرفتار ہونا ناگزیر ہے۔ اور اگر اس کے یہاں ان جذبات کے سوتے سوکھ گئے ہیں تو شاعری کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصنوعی عشق کرے اور تصوراتی طور پر وہ ساری فضا اپنے اوپر طاری کرے جو ایک عاشق کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ہمیں داغ دہلوی کے یہاں یہ فضا اسی عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس دور کے بڑے بوالہوس اذیت کوش اور شعلہ مزاج تھے۔ حالانکہ ان کی زندگی کا مطالعہ ان تمام باتوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ بات صرف داغ دہلوی تک ہی محدود نہیں بلکہ اکثر شاعروں کی حیات

اور شاعری ایک دوسرے کی تضاد ہے مثلاً ریاض خیر آبادی کی شاعری ان کو رندوں اور سرمستوں کا امام بنا کر پیش کرتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کمبخت کو منہ ہی نہیں لگایا۔ کبھی چکھا ہی نہیں۔ لیکن خمریات کے سارے لوازمات اور ساری فضا ان کی شاعری میں موجود ہے۔

داغ دہلوی کے تلامذہ میں ایسے شعراء کی تعداد کافی ہے جو بہت مشہور ہوئے ان میں ڈاکٹر اقبال، سائل دہلوی، نوح ناروی اور حسن بریلوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال فطری طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ اس لیے ان کی شاعری کی ہیئت ہی دوسری ہے وہ شاعر کم اور مبلغ زیادہ نظر آتے ہیں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اقبال کے یہاں غزل اس صورت میں موجود نہیں، جس صورت میں داغ کے یہاں یا داغ کے دوسرے تلامذہ کے یہاں ملتی ہے۔ میری اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اقبال بین الاقوامی حیثیت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری عظیم ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں۔ لیکن غزل کے جو فطری تقاضے ہیں وہ ان کے یہاں کم نظر آتے ہیں۔ سائل دہلوی کے یہاں بھی داغ اسکول کی پوری نہیں ملتی۔ لیکن کافی حد تک وہ اسکول کے قریب ہیں۔ نوح ناروی نے صرف زبان کا خیال رکھا۔ اس لیے فکری گہرائی ہمیں ان کے یہاں نہیں ملتی مگر زبان کے سلیقہ میں نوح کی حیثیت مستند ہے۔

جہاں تک حسن بریلوی کا تعلق ہے وہ داغ دہلوی کے اور داغ اسکول کے مستند شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ داغ اسکول کے سارے لوازمات بھی حسن بریلوی کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کا معشوق بھی اسی گوشت و پوست کا انسان

ہے۔ حسن ... شت پوست کے انسان سے محبت کرتے ہیں ۔مگر ان کے یہاں داغ کا چلبلا پن نہیں بلکہ ایک متانت وسنجیدگی پائی جاتی ہے ۔اور وقار کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جو اول تا آخر قائم رہی ۔ان کا معشوق انہیں کسی منزل پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ خود حسنؔ بریلوی کی زبان سنئے۔

دیکھو تو حسنؔ لوگ تمہیں کہتے ہیں کیا کیا
کیوں عشق کیا آپ نے اس دشمنِ دیں سے

بات غزل کی اپنی ایک مخصوص فضا کی چل رہی تھی ۔ حسن بریلوی بھی اس فضاء سے پہلو نہیں بچا پائے ۔ یہ بات صرف حسن ہی تک محدود نہیں بلکہ بڑے بڑے شعراء اس فضاء سے اپنے کو نکال نہ سکے ۔ بہت سی مثالیں غزل کے اشعار میں آپ کو مل جائیں گی ۔جہاں جنسی بوالہوسی بھی ہے اذیت کوشی بھی ، پیش دستی بھی ہے اور کچھ حاصل کر لینے کی خواہش بھی۔

ہم سے کھل بھی جاؤ بہ وقت مئے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن
(غالبؔ)

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں
(ناسخؔ)

یاں گرہ کھل گئی دل کی وہاں انگیا اسکی
لب نازک سے صدا آنے لگی بس بس کی
(مخبر لکھنوی)

حسن بریلوی بھی اس رو میں ہیں مگر آخرالذکر اشعار تک نہیں گئے بلکہ اعتدال میں رہ کر بوس وکنار سے دوچار ہوئے۔

بولے وہ بوسہ ہائے پیہم پر
ارے کمبخت کچھ حساب بھی ہے
(حسن بریلوی)

یہ تمام اشعار ان شعرا کے ہیں جو داغ اسکول کے نہیں مگر ان کے یہاں بھی وہ فضا موجود ہے۔ حسن بریلوی کے یہاں بھی وہی فضا ملتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ بہت کافی ملتی ہے۔ مگر اس کے اظہار میں اعتدال ہے۔ ان کے یہاں وصال کی خواہش بھی ہے۔ اور وصال کے بعد کی چاشنی بھی۔ گستاخی بھی ہے اور معشوق کی عشوہ طرازی بھی، شوخی بھی ہے اور شرارت بھی، دعوت بھی ہے اور خود سپردگی بھی۔ معشوق کی جانب سے ہلکا سا احتجاج بھی ہے اور دعوتِ پیش دستی بھی) ۔ ان کے بہت سے اشعار ان کے عشق کو مجازی رنگ دینے میں اس شارح کے ساتھ ہیں جو آن کے اشعار کی شرح کرے۔ چند نمونوں سے میری بات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

کسی کا شعر ہے۔

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

حسنؔ بریلوی کہتے ہیں۔

ہمیشہ تم مجھے کہتے ہو بے حیا گستاخ
دھری رہیں گی یہ باتیں جو ہوگیا گستاخ

ان کی غزل میں صنف نازک بھی اپنی پوری آب و تاب سے موجود ہے۔ اور ہندستانی فضاء بھی اس لیے کہ گھونگھٹ صرف ہندستان کی دین ہے۔

وصل میں جب ہاتھ گھونگھٹ کو لگایا اے حسن
شرم بولی منہ چھپا کر یہ سعی ابھی نہیں

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ حسنؔ کے یہاں تصوف موجود ہے۔ حسنؔ کے یہاں تصوف ضرور موجود ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ وہ بہرحال ایک صوفی گھرانے سے متعلق تھے۔ عشق حقیقی نے حسنؔ کو بھی متاثر کیا۔ حسنؔ نے اسے برتا بھی ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ عشق مجازی میں وہ اس مقام پر نظر نہیں آتے۔ جس مقام پر دردمند یا اس قبیل کے دوسرے شعراء نظر آتے ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ جس اسکول سے متعلق تھے اس اسکول کے لوازمات سے اپنے آپ کو بچا نہیں پائے۔ تصوف کی چند مثالیں میری بات کی وضاحت کرتی ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو بے خودی سے
پردہ تھا جمال خود نما کا

اس قدر یکرنگ ہوں ہم تم کہ کچھ کھلنے نہ پائے
جلوہ فرما کون ہے محوِ تماشا کون ہے

حسؔن بریلوی کا تصور عشق بہتوں سے مختلف ہے وہ اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کے یہاں متانت وسنجیدگی کے ساتھ اور کسی حد تک شوخی وبے باکی چھلکتی ہے۔ وہ جیسا محسوس کرتے ہیں ویسے ہی اپنے معشوق کی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ حسؔن بریلوی کا معشوق شوخ ہے، چلبلا ہے مگر ایسی شوخی کا مالک ہے جس میں شعلہ پن نہیں بلکہ ایک وقار، ایک متانت اور ایک سنجیدگی ہے۔ حالانکہ دونوں متضاد کیفیتیں ہیں مگر عامیانہ پن ان کے معشوق سے سرزد نہیں ہوتا جب کہ داغؔ کے یہاں عامیانہ پن واضح ہو جاتا ہے۔ حسؔن کی غزل کا عاشق عشق میں مخلص ہے۔ موقع پرست نہیں۔ لیکن تمام بشری تقاضوں سے مملو ہے۔ اسے قدم قدم پر وصال یار کی خواہش ہے۔ وہ بہت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیتا ہے۔ ان کا عاشق شعلہ مزاج یا عامیانہ جذبات کا مالک نہیں۔ شعراء عموماً معشوق کو ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں جیسے وہ صرف ظالم و جابر انسان ہے۔ مگر حسن کا معشوق ایسا نہیں نہ وہ ظالم ہے نہ ستمگر بلکہ محتاط ہے۔ مگر اکثر بوس وکنار پر راضی بھی ہو جاتا ہے۔ اور کبھی عاشق کی جرأت وگستاخی پر اور بیشمار بوسہ بازی پر اسے تنبیہ بھی کرتا ہے۔

کیا کہوں کیا ہے میرے دل کی خوشی
تم چلے جاؤ گے خفا ہوکر

حسؔن بریلوی داغ اسکول کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے کلام سے چند اور مثالیں پیش خدمت ہیں تاکہ قاری حسؔن کی اردو غزل کی حیثیت اور ان کے مقام کا تعین کر سکے۔

اے مست مئے ناز ذرا دیکھ کے چلنا
بس جائے کہیں دل نہ کسی خاک نشیں کا

حضرت دل مزاج کیسا ہے
پھر بھی اس کوچہ میں گزرہوگا

الفت ان کی نہیں چھوڑی جاتی
حال دل کا نہیں دیکھا جاتا

اپنے مطلب کے آشنا ہو تم
سچ ہے تم کو کسی سے کیا مطلب

کیا کہوں کیا کہہ رہی ہے یہ گھٹا یہ فصلِ گل
کیا کہوں کیا چاہتے ہیں شیفتہ و میخانہ آج

صفائے حسن سے محرومی دیدار کی باعث
نظر آتی ہے اپنی شکل ہم کو روئے جاناں میں

ہائے دشمن دیکھیں ان کے اُٹھتے جوبن کی بہار
ہائے میں کوئی نہ ہوں میری نظر کوئی نہ ہو

پوچھتے کیا ہو کہ دل میں کون ہے
لو یہ آئینہ اٹھا کر دیکھ لو

جان اگر ہو جان تو کیونکر نہ ہو تجھ پر نثار
دل اگر ہو دل تری صورت پہ شیدا کیوں نہ ہو

میں کس گنتی میں ہوں اور اک مرے دل کی حقیقت کیا
ہزاروں جان دیتے ہیں وہ صورت ہی کچھ ایسی ہے

بلا سے اک دل مضطر اگر گیا تو کیا
مزے تو ہم نے تیری شوخی نظر کے لیے

ترے در سے کوئی پھرا ہو گا
رہ گئے ہم تو خاک میں مل کے

مولانا کی شاعری کے دیوان ثمرِ فصاحت میں فکر و آہنگی، شعور و ادراک، نازکی رعنائی، شوخی اور کھلتا ہوا اندازِ بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔ غزلوں سے لطافت

اور حسن و بانکپن ٹپکتا ہے۔ مولانا کی غزل گوئی میں، دیوانگی کے رنگ نظر آتے ہیں انہوں نے جنوں انگریزی سے کام لیا، شکوہ شکایت کا مظاہرہ کیا، ہجر و فراق کے نالے بلند کیے، خود کو خانہ خراب کہا۔ اپنے محبوب سے لطف اندوز ہونے کا ایک انداز دیکھیے ۔

کون کہتا ہے کہ آپ آئیں مسیحا بن کر
کیا مریضوں کی عیادت بھی بری ہوتی ہے

مولانا حسنؔ کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد نقد و تجزیہ سے کام لیتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اپنے عہد کے غزل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں بلند خیالی اور رفعت تخیل پائے جاتے ہیں۔ ندرت کے علاوہ افکار نو کی فضا بندی بھی ملتی ہے۔ عام بول چال، روزمرہ کی زبان، مانوس، اور شگفتہ الفاظ اور حسب ضرورت محاورات و رمز و کنایات و استعارات اور پیکروں کا استعمال ہے۔

احسنؔ مارہروی مولانا حسن رضا کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

کہ وہ شیرِ خموشاں میں ہیں باتیں رہ گئیں انکی
انہیں باتوں کو حاصل اب حیات جاودانی ہے
وہ باتیں سر بسر گویا سخن سنجوں کی باتیں ہیں
کہ جن میں عاشقانہ رنگ کی شیریں زبانی ہے
انہیں باتوں سے باتوں باتوں میں بن گیا دیواں
کہ جس کی ہر غزل سرمایہ دار خوش بیانی ہے

احسن مارہروی داغ کے شاگرد تھے اور مولانا حسن بھی۔ اس تعلق کو الگ رکھ کر دیکھیں تو دوسرے بہت سے ایسے شعراء اور ناقدین ہیں جنہوں نے مولانا کی شاعری کی تعریف کی اور اپنے زمانہ کا ایک نافراموش شاعر تسلیم کیا ہے۔ اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں دوسرے شہروں کی طرح بریلی کا بھی ایک مقام ہے۔ یہاں متعدد بڑے اہم شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے بزمِ شعر وسخن کو سجایا ہے۔ غزل، نظم، قصیدہ، رباعیات، قطعات، مثنوی وغیرہ اصناف سخن کے استاد یہاں گزرے ہیں۔ حسن بریلوی نے اپنے شاگردوں کی ایک لمبی جماعت چھوڑی ہے

مولانا حسن بریلوی کے تمام سوانح نگاروں نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا تمام علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ وتاریخ، منطق و حکمت وغیرہ۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ مولانا حسن بریلوی کس قابلیت کے مالک تھے۔ اوران کی ذات میں کیا کیا خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ حد درجہ زودحس اوران کی فطرت حساس وادراک تھی۔ ان کا تنقیدی شعور پختہ تھا۔ مولانا حسن بریلوی جس خصوصیات کے مالک تھے۔ انہوں نے ان کی شخصیت کو ہمہ گیری عطا کی تھی۔ قادرالکلام اور بڑا شاعر بنانے میں ان کی شخصیت نے اہم کردار ادا کیا۔ انہیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اور طبیعت بھی موزوں تھی۔ شعر کہنے کی صلاحیت انہیں بچپن سے تھی۔ داغ دہلوی سے استفادہ سخن کرنے کے بعد ان کے کلام میں مزید پختگی آگئی تھی۔ یہ بات سامنے آچکی ہے۔ مولانا حسن بریلوی کی شاعری میں داغ کے کلام کی خصوصیات اور رنگ وآہنگ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں حسرت موہانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مولانا کی شاعری میں اور داغ کے کلام میں اس قدر

احسنؔ مارہروی داغؔ کے شاگرد تھے اور مولانا حسنؔ بھی۔ اس تعلق کو الگ رکھ کر دیکھیں تو دوسرے بہت سے ایسے شعراء اور ناقدین ہیں جنہوں نے مولانا کی شاعری کی تعریف کی اور اپنے زمانہ کا ایک نافراموش شاعر تسلیم کیا ہے۔ اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں دوسرے شہروں کی طرح بریلی کا بھی ایک مقام ہے۔ یہاں متعدد بڑے اہم شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے بزمِ شعر وسخن کو سجایا ہے۔ غزل، نظم، قصیدہ، رباعیات، قطعات، مثنوی وغیرہ اصناف سخن کے استاد یہاں گزرے ہیں۔ حسنؔ بریلوی نے اپنے شاگردوں کی ایک لمبی جماعت چھوڑی ہے

مولانا حسنؔ بریلوی کے تمام سوانح نگاروں نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا تمام علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ وتاریخ، منطق وحکمت وغیرہ۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حسنؔ بریلوی کس قابلیت کے مالک تھے۔ اور ان کی ذات میں کیا کیا خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ حد درجہ زود حس اور ان کی فطرت حساس وادراک تھی۔ ان کا تنقیدی شعور پختہ تھا۔ مولانا حسن بریلوی جس خصوصیات کے مالک تھے۔ انہوں نے ان کی شخصیت کو ہمہ گیری عطا کی تھی۔ قادرالکلام اور بڑا شاعر بنانے میں ان کی شخصیت نے اہم کردار ادا کیا۔ انہیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اور طبیعت بھی موزوں تھی۔ شعر کہنے کی صلاحیت انہیں بچپن سے تھی۔ داغؔ دہلوی سے استفادہ سخن کرنے کے بعد ان کے کلام میں مزید پختگی آگئی تھی۔ یہ بات سامنے آچکی ہے۔ مولانا حسنؔ بریلوی کی شاعری میں داغؔ کے کلام کی خصوصیات اور رنگ وآہنگ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں حسرتؔ موہانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مولانا کی شاعری میں اور داغؔ کے کلام میں اس قدر

یکسانیت ہے کہ دونوں کے کلام میں مشکل سے فرق نظر آتا ہے۔ اس بنا پر ہم مولانا حسنؔ کو داغؔ کا سچا جانشین بھی کہہ سکتے ہیں۔ ادبی تجزیے میں دیکھیے۔

مولانا کے کلام میں پختگی ہے اور انہوں نے اپنے استاد کے رنگ کو کامیابی سے برتا ہے اس لیے مولانا کو بجا طور پر جانشین داغؔ کہا جا سکتا ہے۔ صابرؔ صاحب کو مولانا کی شاعری میں دو چیزیں نظر آئیں۔ اول پختگی اور دوم استاد داغؔ کا رنگ۔

مولانا حسنؔ بریلوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شعر کہتے تھے پھر اس پر تنقید کرتے تھے اور اس کے بعد شعر کی نوک پلک درست کرتے تھے شعر میں کوئی خامی پائی جاتی تھی تو اس کی اصلاح کرتے تھے۔ وہ شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ، محاورات اور تشبیہات و استعارات کی جانچ پڑتال بھی کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں پختگی پائی جاتی ہے۔

داغؔ دہلوی کی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں سادگی، روانی، سلاست، عام بول چال کے الفاظ اور محاوروں کا استعمال ملتا ہے۔ اس کے علاوہ گہری معنویت ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ داغؔ کے انہیں اوصاف کو حسنؔ بریلوی نے اپنے کلام میں برتا ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں میں قربت اور دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہو۔ اس کا اعتراف مولانا کے علاوہ خود داغؔ دہلوی نے ''پیارے شاگرد'' کہہ کر کیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں

یاد ہیں رامپور کے جلسے
انکی شفقت کا حال کیا کہیے
پیارے شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزا کہیے

مولانا اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس بات کو دہراتے رہے کہ ہمارے کلام میں جو خوبیاں پیدا ہیں جو گلفشانیاں اور رنگینیاں ہیں یہ سب حضرت داغؔ کی کرم فرمائی کی وجہ سے ہیں ایک شعر میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لطف ان سُست مضامین میں کہاں سے آئے
اے حسن گر کرم حضرتِ استاد نہ ہو
یہ گلفشانیاں تو ہوتیں کبھی اے حسنؔ
تم نے چنے ہیں پھول گلزارِ داغ کے

ان اشعار و بیان سے عیاں ہوتا ہے کہ مولانا کی شاعری میں داغؔ کا رنگ گہرا اور بہت گہرا ہے اس بات میں کچھ شک نہیں کہ مولانا حسنؔ دبستانِ داغؔ سے متعلق تھے اور اپنی غزلوں (ثمرِ فصاحت) اور نعتیہ کلام سے اپنی شاعری کی اشاعت کرتے رہے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے وہ داغؔ کے رنگ ہی میں گھرے رہے اور شاعری میں ان کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ ان کی طبیعت کی افتاد میں سادگی تھی وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں تصوف کے اثرات تھے اس لیے انہوں نے تصوف کے اثرات قبول کیے اور اخلاقی مضامین کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور دنیاوی بوقلمونی سے بیزاری کا اظہار کیا۔ مولانا کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا جو انداز ملتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے غالب کا اثر بھی قبول کیا تھا۔ وہ غالب کی مشکل پسندی کے قائل نہیں تھے۔ اسی طرح انہوں نے عشق و محبت اور حسن کے بیان میں صداقت و واقعات سے کام لیا ہے۔ جس سے ان کا کلام مومنؔ کے

قریب ہو جاتا ہے۔ منشی شریف خاں لکھتے ہیں ؎

فصاحت میں جو ہے ہم رنگِ مومنؔ
نظر آتی ہے غالبؔ کی بلاغت

اور جناب حسنؔ بریلوی کہتے ہیں ؎

مضامیں ہیں امیرؔ نامور کے
زباں اس میں جناب داغؔ کی ہے

مولانا حسنؔ بریلوی نے صرف رسمی طور پر شاعری نہیں کی ہے بلکہ اسے ایک فن کے طور پر برتا ہے۔ اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک بلند اور معیاری شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ زبان و بیان کی لطافت و نزاکت حسن و رعنائی، دلکشی اور بانکپن شاعری کی شدت احساس اور اشعار کی شدت تاثیر جب یکجا ہو جاتی ہے تو شاعری بنتی ہے۔ یہ تمام عناصرِ مولانا کی شاعری میں موجود ہیں۔ ''ثمرِ فصاحت'' کے اشعار میں زیادہ تر عشق کا تصور ملتا ہے عشق حقیقی اور عشقِ مجازی جس پر عشق مجازی، حاوی ہے، اس کی بے قراریاں ہیں اور اسی کا درد و کرب ہے مولانا نے شاعری میں اسی دن قدم رکھ دیا تھا جب وہ اپنے گھر سے فاضل ہوئے یعنی شعور و ادراک غور و فکر اور علم و فن کی قوت سے مالا مال۔ ان ہی شعوری اور لاشعوری کیفیتوں سے انہوں نے فن شاعری اور لطافت شعر و سخن سیکھا اور طاق ہوئے۔ ان کے انداز کی دنیا میں ایک بھونچال تھا مزاج میں ایک غیر یقینی کیفیت تھی۔ فعال اور منفعل عناصر ایک دوسرے سے متضاد ہو کر بے نام و نشان ہو گئے۔ ذیل کے اشعار میں ان کی بے ہمتی کا عالم

دیکھیے ۔

دل میں ہجوم یاس ہے امید چل بسی
اتنا بسایا قصر کہ ویران ہو گیا
نہ قید زلف میں ہے مرغ دل نہ سینے میں
نہ یہ قفس کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے
کس طرح ضبط کریں رونے کو
زخم کو دل میں چھپائیں کیونکر
نہ کہیں تو یہ کلیجہ ٹکڑے
کوئی پوچھے تو سنائیں کیونکر

مولانا کی شاعری میں داخلیت کا رنگ گہرا ہے۔ خارجیت کی حیثیت ذیلی ہے۔ ان کی شاعری میں احساسات و جذبات کی فراوانی نے خارجیت کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ وہ حساس طبیعت کے مالک تھے اسی وجہ سے ان کی شاعری میں احساس کی شدت ہے۔ احساس کی شدت نے فطرت کی رنگینیوں اور سحر طرازیوں کو ان کے دامن میں بھر دیا ہے۔ بہار و شباب، فصل گل، باد بہاری، شادابی و رعنائی کائنات کے ذرے ذرے میں پائے جانے والے حسن و خوبی کا انہوں نے بخوبی احساس دلایا ہے اور اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ آغوش فطرت میں مچلتے ہوئے نظر آتے ہیں بصری، سمعی، ذوقی، لمسی اور شامی احساسات کی ان مختلف صورتوں کو مولانا حسن بریلوی اپنی شاعری میں بخوبی استعمال کرتے ہیں چند مثالیں دیکھیے ۔

یہ فصلِ گل یہ جھوم کر آنا سحاب کا
ساقی میں اور ایک پیالہ شراب کا
دیکھا ہے جب سے حُسن رخ بے حجاب کا
رنگ آفتاب میں ہے گل آفتاب کا
چھینٹے یہ دے رہا ہے برسنا سحاب کا
ٹھنڈی ہوا میں دور ہو جام شراب کا

ذیل کے اشعار کو بھی پڑھئے اور اندازہ لگائیے کہ مولانا حسنؔ بریلوی کی قوت سماعت کتنی تیز ہے۔

دل نہ دینے کی شکایت ہے عدو کے سامنے
یہ تو کہئے آپ کا وعدہ وفا ہو جائے گا
وصل عدو کا حال سنانے سے فائدہ
للہ رحم کیجئے بس بس سنا سنا
آپ کیا کہتے ہیں دشمن کے برابر ہے حسنؔ
خوب ہوتا جو میں دشمن کے برابر ہوتا

اسی طرح ان کے دوسرے اشعار میں احساسات کا ذکر ہے جب یہ احساسات شدت اختیار کر لیتے ہیں تو مولانا حسنؔ بریلوی کے جذبات وارادات کے روپ میں بدل جاتے ہیں۔ ہر شاعر کے یہاں جذبات ہی ہوتے ہیں۔ جو شاعری کو بڑا کرتے ہیں۔ اگر جذبات نہ ہوں تو وہ شاعری تک بندی کہلائے گی۔ میرؔ، غالبؔ، ناسخؔ، مومنؔ، ذوقؔ، داغؔ، انیسؔ اور نسیمؔ سب کے یہاں جذبات کی شدت نظر آتی

ہے۔ شاعری میں عام طور پر دو ہی طرح کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک انتہائی غم دوم انتہائی خوشی یا مسرت۔ خوف و ڈر کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ مولانا حسنؔ بریلوی کی شاعری میں اگر جذبات کو تلاش کریں تو ان کے یہاں ہجر و فراق کی منظر کشی کو دیکھیں گے۔ جہاں وہ شدید غم میں درد، تڑپ، کرب، بے چینی اور بے قراری وغیرہ کے شکار نظر آتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے ۔

- ساقی خمارِ ہجر کی شدت سے غش ہوں میں
  چھینٹا دے منہ پر اب تو شراب وصال کا
- میری میت پہ وہ منہ ڈھانکے ہوئے بیٹھے ہیں
  کوئی پوچھے تو کہ اب کس سے حیا ہوتی ہے
- سنگِ غم فراق سے دل پر لگا نہ چوٹ
  آئینہ ٹوٹ جائے گا تیرے جمال کا
- آنکھیں ترس رہی ہیں طبیعت نڈھال ہے
  تیرے فراق میں ہمیں جینا محال ہے

اب آیئے اس بات کا اندازہ لگائیں کہ ان کی نئی شاعری میں نشاط و سرور اور فرحت و انبساط کس حد تک پایا جاتا ہے ۔

- اے جانِ گل گزرتے ہیں جس رہ گزر سے آپ
  کہتی ہیں نکہتیں کہ گئے ہیں ادھر سے آپ
- احباب کو حسنؔ وہ چمکتی غزل سنا
  ہر لفظ سے ہو جس کے نمودار آفتاب

مولانا حسنؔ بریلوی کے اشعار پڑھ کر لگتا ہے کہ جذبات کا سمندر امنڈ رہا ہے اور ٹھاٹھے مار رہا ہے کہیں وہ شدتِ غم سے دوچار ہیں تو کہیں سرور کیف و نشاط سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شاعری میں جو جذبات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں وہ فکر و تخیل کی آتشِ سوز میں پک کے آتے ہیں۔ دراصل جذبات اور فکر و تخیل کے امتزاج سے ہی شاعری میں عظمت آتی ہے۔ مولانا حسنؔ بریلوی کے دل و دماغ کی کیفیت کو ذیل کے شعر سے سمجھیے۔

انگلیاں کانوں میں دے دے کے سنا کرتے ہیں
دل میں اب کیا عجب شور ہے برپا تیرا

مولانا کی خلوت میں ایک شور ہے رگ رگ میں خلش ہے جو رہ رہ کے چبھ رہی ہے۔ مولانا کا شور وجدان اور عرفان کی سرحدوں تک جاتا ہے۔ شاعری جذبات کی فراوانی کا نام ہے۔ وارداتِ قلب اور کیفیاتِ دل کی لہروں کا نام ہے۔ اور ان لہروں کے ساتھ تخیلات کی رنگین فضاء کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہی مولانا حسنؔ کی شاعری کا رنگ ہے۔ مولانا کے یہاں افکارِ نو کی فضا بندی ہوتی ہے۔ ذیل کے شعر میں جلوۂ مجاز اور فلسفیانہ خیالات کی ادائیگی دیکھیے۔

فراقِ دائمی اس وصل کے پردے میں پنہاں ہے
کسی سے دل سے مل کر دل سے ملنا ہو نہیں سکتا

مولانا اپنی شاعری میں کہیں محبوب کی اداؤں کا ذکر کرتے ہیں اور کہیں ان کی صفات کا کہیں ان کے یہاں لب و دندان کا بیان ہے اور کہیں زلف و رخسار کا۔ کبھی حسنِ جمال کا تذکرہ کرتے ہیں اور کبھی جلوۂ رنگین کا۔ وہ اپنے محبوب کے اخلاق

ومروت کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور کہیں اس کے جور و ستم کا رونا روتے ہیں۔ غرض وہ مختلف خیالات اور تصورات سے اپنے نگار خانے کو زینت بخشتے ہیں:
حسؔن بریلوی کی شاعری میں نئی ترتیب اور منفرد تصورات کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

دل میں یا انجمن ناز میں یا آنکھوں میں
تھی غرض دیکھنے سے ہم کو کہیں دیکھ لیا

اس شعر میں دید کے معنی اس قدر وسیع اور پر لطف ہیں۔ دید میں یہ افضلیت حسؔن بریلوی کی قوت فکر کی وجہ سے آئی ہے ہر غزل میں شاعر عاشقِ مجازی ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی کو اپنا معشوق بناتے ہیں اور اس کے غمزہ و ادا نیز اس کی عشوہ طرازی کے قتیل ہوتے ہیں۔ محبوب کی دید کا طالب ہونا شاعر کا ایک فطری جذبہ ہوتا ہے۔ فرہاد نے جوئے شیر جاری کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ مجنوں نے جگہ جگہ خاک چھانی اس لیے کہ وہ اپنے محبوب کو دیکھ سکیں اور حاصل کر سکیں۔ دید کی طرح وصال کی تمنا کرنا بھی شاعری کا ایک جذبہ ہے۔ یہ باتیں حسؔن بریلوی کے ذہن میں بھی تھیں جنہیں نئی تراکیب کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے انہوں نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔
محبوب کی آمد کو شاعر مسیحا کی آمد سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ان کے آنے سے مریض عشق پر جو اثر پڑتا ہے وہ یہ کہ چہرہ و رخ پر رونق آجاتی ہے اردو شاعری کے اس عام خیال سے ہٹ کر مولانا حسؔن بریلوی کی راہ مختلف ہے۔ وہ محبوب کی آمد کو مسیحا کی آمد سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ انسانیت کے ناطے وہ اس کی آمد کو مزاج پرسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے خیالات لانے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس لیے جو معنی آفرینی، جو خیالات کی رنگینی جو جدت ان کے کلام

میں نظر آتی ہے انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مندرجہ ذیل اشعار سے میرے اس خیال کی بخوبی وضاحت ہوسکتی ہے اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

اپنا ہی ہے قصور ہمیں تم سے دور ہیں
تم تو ہمارے ساتھ رہے ہم جدھر گئے
یہ حسن خود فروش عجب جنس ہے حسن
وہ بک گئے جو اس کے خریدار ہو گئے

—— ؀ ——

کتابیات

آب حیات	محمد حسین آزاد	مبارک بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۰ء
آئینۂ قیامت	مولانا حسن بریلوی	اہل سنت بریلی	
اربابِ نثر اردو	محی الدین قادری زور	اعتقاد پبلیکیشنز، حیدرآباد	۱۹۶۸ء
اردو نثر کا فنی ارتقا	فرمان فتحپوری	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۴ء
اردوئے معلّٰی (رسالہ)	ایڈیٹر حسرت موہانی	علی گڑھ	۱۹۱۲ء
امام احمد رضا خاں بریلوی ایک ہمہ جہت شخصیت	مولانا کوثر سیالکوٹی		۱۹۸۱ء
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	بزمِ خضرِ راہ دہلی	۲۰۰۱ء
تاریخِ شعرائے روہیلکھنڈ	سید تعظیم علی نقوی	فرہان پبلشر، کراچی	۱۹۹۰ء
ثمر فصاحت	مولانا حسن بریلوی	اہل سنت بریلی	۱۹۰۹ء
چند شعرائے بریلی	لطیف حسین ادیب	تنویر پریس، لکھنؤ	۱۹۷۶ء

حضرت حسن بریلوی کی نعت گوئی	شمس بریلوی	مدینہ پبلشنگ ہاؤس، کراچی	۱۹۹۱ء
خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام	منشی نول کشور لکھنؤ	۱۹۰۸ء
داغ دہلوی	مرتبہ	اردو اکیڈمی، دہلی	۱۹۸۲ء
داغ کے اہم تلامذہ	اسعد بدایونی	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۸۵ء
دلی کا دبستانِ شاعری	نصیر الدین ہاشمی	اتر پردیس اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۹۲ء
ذوقِ نعت	مولانا حسن بریلوی	اہل سنت بریلی	۱۹۰۸ء
رام پور کا دبستانِ شاعری	شبیر علی خاں شکیب	رامپور رضا لائبریری، رامپور	۱۹۹۹ء
شعرِ حسن	نذیر لدھیانوی	رضا پبلشر، لاہور	۱۹۷۸ء
شعر شور انگیز ج ۱۔ ج ۴	شمس الرحمان فاروقی	قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی	۱۹۹۵ء۔۱۹۹۱ء
شعر الہند ج ۱۔ ج ۲	عبد السلام ندوی	معارف پریس، اعظم گڑھ	۱۹۹۶ء
لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ابو اللیث صدیقی	اعلیٰ پریس، دہلی	۱۹۹۰ء
مقدمہ شعر و شاعری	حالی	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۹۸ء
ماہنامہ نعت (خصوصی نمبر)			شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء
مولانا حسن بریلوی نمبر	ماہنامہ سنی دنیا ایڈیٹر محمد شاہ رضوی	بریلی	اگست ۱۹۹۴ء
نگارستان لطافت	مولانا حسن بریلوی	اہل سنت بریلی	۱۹۱۱ء
نعت کے چند شعرائے متقدمین	سید شمیم گوہر	الہ آباد	۱۹۸۵ء

MAULANA HASAN BARAILVI KI ADABI KHIDMAT

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
In partial fulfillment of the requirements
For the award of the degree of
MASTER OF PHILOSOPHY

BY
GULSHAN ARA

Supervisor
PROF. NASEER AHMAD KHAN
(Chairperson)

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGE LITERATURE AND CULTURE STUDIES
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI –110067
INDIA
2003